دکھیارے

(ناولٹ)

انیس اشفاق

سرورق	:	نوریاب نکہت
پہلی اشاعت	:	۲۰۱۴ء
ناشر	:	انیس اشفاق
قیمت	:	۲۰۰ روپے
تعداد	:	۴۰۰
جائے فروخت	:	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ دانش محل، لکھنؤ

Dukhyare
By
Anis Ashfaq

Rs.200/-

'گل زمین'، ۴/۱۵۸، وپل کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۰

موبائل: 09451310098

ای میل: s.anisashfaq@gmail.com

وہ زمانے جو ہو گئے کہیں گم
ان زمانوں کا نوحہ گر ہوں میں

فراست رضوی

اس ناولٹ کے تمام واقعات و کردار فرضی ہیں
کسی سے ان کی مطابقت محض اتفاق ہوگی

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ۔
اس کتاب کے مندرجات سے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا متفق
ہونا ضروری نہیں ۔

We are healed of a suffering only
by experiencing it in full.

Marcel Proust

بہت دنوں بعد مجھے ماں کی یاد پھر آئی۔ اس بار مجھے اس کی یاد اس لیے آئی کہ میں ایک بہت اہم کاغذ کی تلاش میں اپنے پرانے کاغذوں کو کھنگال رہا تھا کہ اچانک میرے ہاتھ وہ رقعہ لگ گیا جسے کئی برس پہلے بھائی کی موت پر بھائی کے سوگواروں کو جمع کرنے کے لیے میں نے خود لکھا تھا۔ بھائی کے جن سوگواروں میں یہ رقعہ تقسیم ہوا تھا، اُن میں سے قریب قریب سب نے یہ رقعہ پڑھ کر اس وقت جب وہ بھائی کی تعزیت کے لیے جمع ہوئے تھے، اس کا ایک دوسرے سے بڑی دیر تک ذکر کیا تھا اور ان میں بھی وہ جنھوں نے بھائی کو ان کی زندگی میں طرح طرح کی زندگیاں گزارتے دیکھا تھا، رقعے کی عبارت کو بڑی دیر تک پڑھتے رہے تھے۔

بھائی کی موت بڑی اذیت میں ہوئی تھی۔ جس وقت اُن کا دم نکل رہا تھا میں ان کے پاس تھا، ماں کے آخری وقت میں بھی میں ہی ان کے پاس تھا۔ ماں کی آخری سانس بڑی مشکل سے نکلی تھی، بہت دیر تک دم اُن کے سینے میں اٹکا رہا، پھر کسی نے جو انھیں دیکھنے کے لیے آیا تھا، بتایا کہ ان کے پیروں کا دم نکل چکا ہے، اب انھیں مرا ہی سمجھو۔ ماں کی موت صبح کے وقت ہوئی تھی جب پو پھٹ رہی تھی اور بھائی کی موت اس وقت ہوئی جب مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ ماں کی موت کے وقت بھائی کا سن پچیس برس تھا اور ماں کی موت کے پچیس برس بعد بھائی کی موت ہوئی۔ بھائی نے پچاس برس کی زندگی جی لیکن یہ زندگی عام لوگوں کی سی زندگی نہیں تھی۔

●

بھائی کی موت سے متعلق رقعے پر نگاہ پڑتے ہی مجھے ماں کی یاد آنے لگی کیونکہ ماں بھائی کو بہت عزیز رکھتی تھی اور بہت عزیز رکھنے کا سبب یہ تھا کہ بچپن ہی سے بھائی کے دماغ میں خلل تھا۔ عمر بھر وہ اول جلول حرکتیں کرتے رہے۔ ماں ان کے دماغی خلل سے بہت پریشان رہتی۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ خلل دور ہو جائے لیکن بھائی کا خبط اس کی موت سے پہلے تک اُسی طرح قائم رہا۔ ماں کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، پھر بھی وہ بھائی کو اچھی تعلیم دلوانا چاہتی تھی۔ اس کے لیے اُس نے دن رات محنت کی۔ بچوں کو پڑھانے سے لے کر سلائی کڑھائی تک اس نے طرح طرح کے کام کیے لیکن ان سب کا حاصل کچھ نہ نکلا۔ بھائی زیادہ پڑھ نہیں سکے۔ تھک ہار کر ماں نے بھائی کو کام پر لگا دیا لیکن اپنے خلل کی وجہ سے وہ کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں سکے۔ جہاں جہاں انھیں کام پر لگایا جاتا وہاں وہاں سے کچھ کچھ دن بعد ان کی شکایتیں آنے لگتیں اور انھیں کام پر سے ہٹا دیا جاتا۔ لیکن ماں کی طرح بھائی بھی بہت محنتی تھے۔ جتنے دن کام میں ان کا دل لگتا، بڑی محنت سے کام کرتے پھر اس کام سے ان کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی اور پھر وہی کام اُن سے بگڑنے لگتا اور اُسی وقت اُن کی شکایتیں آنے لگتیں۔ جس دن کام پر سے بھائی کو ہٹایا جاتا، ماں بہت رنجیدہ ہوتی اور بھائی اپنے خلل کے باوجود اُسے یقین دلاتے کہ ایک دو روز میں وہ کوئی نیا کام ڈھونڈھ لیں گے۔ بھائی جتنے دن کام کرتے اُس کے روز کے روز انھیں جتنے پیسے ملتے وہ ماں کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتے لیکن کسی کسی دن ایسا بھی ہوتا کہ وہ ماں سے انھیں پیسوں کا حساب مانگنے لگتے اور اس دن ماں سے ان کا خوب جھگڑا ہوتا۔ وہ چیخ چیخ کر کہتے:

''ہم نے تمھیں اتنے پیسے دیے تھے، تم نے کیا کیے؟''

''سب تمھیں لوگوں پر تو خرچ ہوئے ہیں۔'' ماں انھیں سمجھاتے ہوئے کہتی۔

لیکن بھائی کو اُس کا یقین نہ آتا اور وہ اپنی بات پر اڑے رہتے، کہتے:

''ہم کچھ نہیں جانتے، ہمارے پیسے ہمیں دو۔''

''اب تو میرے پاس دمڑی بھی نہیں ہے۔'' ماں جھنجھلا کر کہتی۔

اس پر بھائی غصے میں آ جاتے اور آس پاس رکھی ہوئی جو چیز ان کے ہاتھ میں آ جاتی،

اسے اٹھا کر پھینکنے لگتے اور انھیں میں سے کوئی کوئی چیز ماں پر بھی کھینچ مارتے۔ ایسے موقعوں پر اُن کا خلل جنون میں بدل جاتا۔ وہ اپنے پورے کپڑے پھاڑ ڈالتے اور یہی کپڑے پہنے پہنے پورے محلے میں گھومتے رہتے۔ ایک بار یہ جنون اتنا بڑھا کہ انھوں نے ماں کے سر پر لالٹین کی وہ چمنی دے ماری جسے ماں لالٹین جلانے سے پہلے صاف کر رہی تھی۔ وہ بڑبڑائے جا رہے تھے اور ماں ان کی باتوں کا جواب دینے کے بجائے لالٹین کی چمنی کے ایک مونہہ کو بند کر کے دوسرے مونہہ کی طرف سے پھونکیں مار کر اسے ایک پرانے کپڑے سے گھما گھما کر صاف کر رہی تھی۔ بڑبڑاتے بڑبڑاتے بھائی چیخنے لگے اور چیختے چیختے ماں کے قریب پہنچ گئے اور چمنی اس کے ہاتھ سے چھین کر اس کے سر پر دے ماری۔ بھائی نے چمنی اتنی زور سے ماری تھی کہ ماں اپنا توازن کھو بیٹھی اور زمین پر گر پڑی۔ زمین پر گرتے ہی اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اس حملے میں خود بھائی کا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا تھا اور ان کی انگلیوں سے بھی خون بہنے لگا تھا۔ ماں کو خون میں ڈوبا ہوا دیکھ کر ہم سب اس کی طرف دوڑے اور اسے اٹھا کر بستر پر لٹایا۔ وہ بڑی تکلیف میں تھی۔ شیشے کی بہت سی کرچیاں اس کے بالوں میں الجھ گئی تھیں اور ایک دو ٹکڑے سر کی کھال میں اتر گئے تھے۔ ہم نے بڑی احتیاط سے کرچیاں اس کے بالوں سے نکالیں اور اس کے سر کے بال جو اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ بہت کم ہو گئے تھے، ہٹا کر آہستہ سے کھال میں اترے ہوئے ٹکڑے بھی نکال لیے۔ پھر گرم پانی میں روئی ڈبو کر اس کا زخم پونچھنا شروع کیا۔ اس بیچ بھائی کہیں غائب ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا کہ وہ ماں کے سرہانے لکرونڈے کے بہت سے پتے ہاتھوں میں لیے کھڑے ہیں اور انھیں صاف کر کر کے اُن کے گولے بنا رہے ہیں۔ ہمارے گھر میں جب کسی کو چوٹ لگتی اور زخم سے خون بہتا تو ماں انھیں پتوں کے گولے بنا کر زخم پر ان کا عرق نچوڑ دیتی اور انھیں نچڑے ہوئے گولوں کو زخم پر رکھ کر پٹی باندھ دیتی۔ ایسا کرنے سے خون بند ہو جاتا۔ یہ فوری طور پر گھریلو علاج تھا۔ بھائی کی چوٹوں پر بھی ماں نے کئی بار اسی طرح ان پتوں کا عرق نچوڑا تھا، اسی لیے ماں کا زخم دیکھ کر بھائی کو اِن پتوں کا خیال آیا۔ مجھ سے بڑے اور بھائی سے چھوٹے والے کو جنھیں سب منجھلے کہہ کر پکارتے تھے، بھائی کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔

''پاگل......'' انھوں نے بھائی کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا اور گکروندے کے پتے ان کے ہاتھوں سے چھین لیے۔ ماں جو تکلیف کی وجہ سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی، آنکھیں کھول کر بولی: ''اسے کچھ نہ کہو۔''

بھائی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے اور اپنی انگلیوں سے بہتے ہوئے خون کو اپنے کرتے کے دامن سے پونچھنے لگے۔ اس واقعے کے دن بھائی رات بھر ماں کے پائنتی بیٹھے رہے۔ بیچ بیچ میں وہ ماں کے پاؤں بھی دباتے لیکن ماں اپنے پاؤں سمیٹ کر ہاتھوں کے اشارے سے انھیں منع کر دیتی اور کہتی:

''جاؤ اب سو جاؤ۔''

لیکن بھائی نے رات بھر پلک نہیں جھپکائی۔ صبح جب ماں کی تکلیف کچھ کم ہوئی تو اس نے بھائی کی زخمی انگلیوں کو دیکھا اور دیکھتے ہی بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے پلنگ کے پہلو کی ایک الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی:

''وہاں شیشی میں مرہم رکھا ہے، لگا لو نہیں تو زخم پک جائے گا۔''

کچھ دن تک ماں بہت تکلیف میں رہی، پھر اس کا زخم ٹھیک ہونے لگا، اسی کے ساتھ بھائی کی انگلیوں کے زخم بھی اچھے ہو گئے۔

•

زخم ٹھیک ہو جانے کے بعد ماں نے پھر بھائی کے لیے کام کی تلاش شروع کی، لیکن اس بار بہت کوششوں کے باوجود بھائی کے لیے کہیں کام نہیں ملا۔ بھائی کے خلل کی بات اب عام ہو چکی تھی اس لیے لوگ انھیں کام پر لگانے سے کترانے لگے تھے۔ اب ماں نے یافت کا طریقہ یہ نکالا کہ دن بھر وہ کھانے پینے کی چیزیں تیار کرتی اور شام کو بھائی ان کی فروخت کے لیے نکلتے۔ لیکن یہ سلسلہ بہت دن تک نہیں چل سکا اور ماں کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ اس طریقے میں نقصان ہی نقصان ہے۔ تب ماں نے بھائی کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سے بھائی شہر میں مارے مارے پھرنے لگے۔ جب جی چاہتا گھر آتے، جب جی چاہتا گھر سے نکل جاتے۔ ماں ان سے کچھ نہ کہتی لیکن کبھی کبھی جب بھائی کو گھر کے کسی کونے میں خاموش بیٹھا ہوا

دیکھتی تو بڑی فکرمندی کے ساتھ ان کا چہرہ تکنے لگتی۔ اس وقت ماں کو دیکھ کر یوں لگتا جیسے سوچ رہی ہو، میرے بعد اس کا کیا ہوگا۔

ایک دن ماں کو سوچ میں گم دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا:

''کیا سوچ رہی ہو۔؟''

''کچھ نہیں۔ تمہارا بھائی....''

''کسی کام کے نہیں۔'' میں نے اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے کہا۔

''نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر بولی: ''اپنے دماغ سے مجبور ہے۔''

پھر ایک لمبی سانس کھینچنے کے بعد کہا:

''اس کا خیال رکھنا۔''

''تم تو خیال رکھتی ہو اس کا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔ میرے بعد...... میرے بعد اس کا خیال رکھنا۔ تم دونوں اسے بہت تنگ کرتے ہو۔''

''وہ باتیں ہی ایسی کرتے ہیں۔''

''دماغ سے مجبور ہے۔ سمجھا کرو۔''

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ میں بھی کچھ نہیں بولا۔

●

جس مکان میں ہم رہ رہے تھے اور جسے ہم اپنی ماں کا مکان سمجھتے تھے، ایک دن وہ مکان ماں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جب ہمارے مکان کی قرقی ہو رہی تھی اور سامان گھر سے باہر نکالا جا رہا تھا، اس وقت ماں نے ہمارے پوچھنے پر ہمیں بتایا کہ باپ نے یہ مکان کسی مہاجن کے پاس رہن رکھ دیا تھا، ماں نے اسے چھڑانے کے لیے اس کا مقدمہ لڑا لیکن وہ مقدمہ ہار گئی۔ مکان ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ماں ہمارے ساتھ مفت کے ٹھکانوں پر رہنے لگی، اِن ٹھکانوں میں سے آخری ٹھکانے پر ایک دن اچانک اس کی طبیعت خراب ہوئی۔ کئی دن تک اسی ٹھکانے پر اس کا علاج ہوتا رہا لیکن جب اس کی طبیعت زیادہ بگڑنے لگی تو اسے ہسپتال میں

داخل کیا گیا جہاں وہ صرف دو دن زندہ رہی۔ ماں کی موت کا بھائی کو بہت دکھ ہوا اور اس سے کہیں زیادہ مجھے۔ کئی دن تک بھائی چپ چپ سے رہے اور مجھے بھی کئی دن تک یقین نہیں آیا کہ ماں اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں اس کی چیزیں دیکھ دیکھ کر اسے یاد کرتا۔ پھر مجھے اس کی باتیں یاد آنے لگتیں۔ ان یاد آنے والی باتوں میں ماں کی ایک بات جو اس نے بھائی کے لیے کہی تھی، مجھے بار بار یاد آتی: ''اس کا خیال رکھنا۔''

میں جب جب بھائی کو اداس دیکھتا، انھیں سمجھاتا:

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ماں کی موت کے بعد بھائی میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ ماں نے مجھ سے ان کا خیال رکھنے کے لیے کہا تھا لیکن اب خود بھائی میرا خیال رکھنے لگے تھے۔ وہ ہر وقت میرے لیے فکرمند رہتے۔ منجھلے سے انھیں زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ ماں کی بیماری کے زمانے میں ہمارا آخری ٹھکانہ بھی ہم سے چھوٹ گیا تھا، اس لیے بھائی نے سب سے پہلے رہنے کے لیے ایک ٹھکانہ تلاش کیا، پھر روزی کی تلاش شروع کی۔ ایک دن انھیں کہیں پر کام مل گیا اور اس میں انھیں اتنا ملنے لگا کہ ہمارا دو وقت کا خرچ پورا ہونے لگا اور میری پڑھائی کی فیس بھی نکل آئی۔

کئی برس تک بھائی نے ٹھکانے بدل بدل کر مجھے اپنے ساتھ رکھا لیکن ایک بار پھر ان کی دماغی حالت بگڑنے لگی اور ان پر پہلے جیسی دیوانگی کا دورہ پڑنے لگا۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ میں کس وقت ان سے الگ ہو گیا۔ اب ہم تینوں کے ٹھکانے الگ الگ تھے بلکہ بھائی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ وہ کبھی کسی مسجد میں پڑ رہتے، کبھی کسی درگاہ میں رہنے لگتے، کبھی کسی امام باڑے میں اور کبھی کسی گرجا گھر کو اپنا مسکن بنا لیتے۔ ایک دن بھائی کے کسی پرانے شناسا نے مجھے بتایا کہ وہ عیسائی ہو گئے ہیں اور فلاں فلاں چرچ میں ان کی اقامت ہے۔ ان کی بات سن کر میں نے طے کیا کہ کسی دن میں اس گرجا گھر کی طرف جا کر معلوم کروں گا کہ کہ بھائی کس حال میں ہیں۔

●

میں جس مکان کے بالائی حصے میں کرائے پر رہ رہا تھا، ایک دن اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بھائی سامنے کھڑے تھے۔ انھوں نے سفید رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا اور ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو اس طرح ترشوایا تھا کہ دور سے بالکل عیسیٰ مسیح معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ان سے اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ کمرے کے اندر آئے اور کرسی پر بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھا:

''کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔ اور آپ؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔''

''کہاں رہے..... اتنے دن''۔ میں نے پوچھا۔

''شہر ہی میں تھا۔''

''یہ......'' میں نے ان کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے 'یہ' کو ذرا کھینچ کر ادا کیا۔

''مذہب بدل لیا ہے میں نے۔ عیسائی ہو گیا ہوں۔''

''کب؟''

جواب دینے کے بجائے انھوں نے کہا: ''پہلے پانی پلاؤ۔''

میں پانی لے کر آیا تو بولے: ''تم بھی عیسائی ہو جاؤ، بہت اچھا مذہب ہے۔'' پھر بولے:

''پرسوں ماں سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں آئی تھی کیا؟''

''ماں تو مر چکی ہے۔'' میں نے کہا۔

''کب؟'' وہ اچھل پڑے۔ پھر غصے سے بولے! ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ پرسوں ہی تو ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ ہم دونوں نے بہت دیر تک باتیں کیں۔''

''ماں مر چکی ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''اچھا تو کہاں دفن کیا اسے''۔ انھوں نے پوچھا۔

''عیش باغ کی کربلا میں۔''

''جنازے میں کتنے لوگ تھے؟''

''محلّے بھر کے۔ اور آپ بھی تو تھے۔''

''میں بھی تھا؟ اچھا تو رہا ہوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ پھر بولے: کچھ پیسے ہیں تمھارے پاس۔''

''کتنے؟'' میں نے پوچھا۔

''پچاس روپے، پچاس تو ہوں گے۔ تمھیں تو اچھا خاصا وظیفہ مل رہا ہے۔''

میں نے انھیں پچاس روپے دیتے ہوئے کہا: ''آپ یہاں رہ سکتے ہیں، میرے پاس۔''

''نہیں، میں جہاں ہوں ٹھیک ہوں۔''

''کہاں ہیں''؟ میں نے پوچھا۔

جواب میں انھوں نے اسی گرجا گھر کا نام لیا جس کے بارے میں ان کے ایک پرانے شناسا نے مجھے بتایا تھا۔

روپے ملتے ہی وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک ان کے بارے میں سوچتا رہا۔

●

ایک روز کہیں سے لوٹ کر جب میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو مجھے ایک لفافہ پڑا ہوا ملا جس پر بھائی کی تحریر میں میرا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے لفافہ کھول کر اس میں رکھا ہوا پرچہ نکالا تو اس میں لکھا تھا:

> ''منجھلے سے ہوشیار رہو۔ وہ تمھیں قتل کرنا چاہتا ہے۔ ماں کی چیزیں سنبھال کر رکھو اور ان کا چھوڑا ہوا روپیہ بینک میں جمع کر دو۔ میں نے موسیٰ باغ میں ایک مکان دیکھا ہے، ہم اس پیسے سے وہ مکان خریدیں گے اور سکون سے وہیں رہیں گے۔ ماں کو بھی اپنے ساتھ رکھیں گے۔ آج کل وہ کہاں ہے۔ پتہ لگاؤ اور مجھے بتاؤ۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔ بڑے امام باڑے کی طرف تمھارا جانا ہوا؟ جانا تو دیکھنا اس کی دیواروں میں شگاف پیدا ہو گئے ہیں۔ ویسے مرمت کا کام میں نے شروع کرا دیا ہے اور آصف الدولہ کو بتا بھی دیا

ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ یہاں کے بعد سوچتا ہوں امجد علی شاہ کے امام باڑے کو بھی ٹھیک کراؤں۔ اس کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ پیسہ بہت خرچ ہوگا لیکن کہیں نہ کہیں سے انتظام ہو جائے گا۔ گومتی بڑھ رہی ہے۔ پانی اکبری دروازے تک پہنچنے والا ہے۔ اُدھر کے لوگوں سے کہو کہ مکان خالی کر کے اِدھر بڑے امام باڑے کی طرف آ جائیں۔ میں نے اس کی چھت پر اُن کے رہنے کا انتظام کر دیا ہے۔

منجھلے سے ہوشیار رہنا، وہ تمھیں قتل کرنا چاہتا ہے۔ میں کہاں ہوں، یہ نہیں بتاؤں گا۔''

تمہارا

بڑا بھائی

خط پڑھ کر میں بڑی دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔

ماں کی زندگی میں بھائی اکثر ناراض ہو کر گھر سے چلے جاتے اور کئی کئی دن تک لوٹ کر نہ آتے۔ بیچ بیچ میں وہ خط لکھ کر ماں کو بتاتے رہتے کہ وہ کہاں ہیں، گھر انھوں نے کیوں چھوڑا اور واپس کب آئیں گے۔ ان سارے خطوں کی عبارت بہت روشن اور سلجھی ہوئی ہوتی۔ یہ پہلا خط تھا جسے پڑھ کر مجھے یقین ہو چلا تھا کہ بھائی کی ذہنی حالت اور زیادہ بگڑ گئی ہے۔ اب میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ میں ان کا ٹھکانہ تلاش کروں اور معلوم کروں کہ وہ کس حالت میں ہیں۔ میں نے ان کے جاننے والوں میں سے کئی سے ان کے بارے میں دریافت کیا لیکن سب نے ایک ہی جواب دیا: ''کئی دن سے نظر نہیں آئے۔''

ایک دن بیٹھے بیٹھے میں سوچ رہا تھا کہ بھائی اگر اس طرف کسی کو نظر نہیں آئے تو ہو سکتا ہے کہیں دور کے علاقے کی طرف چلے گئے ہوں۔ یہ خیال آتے ہی مجھے دور کے محلے میں رہنے والے اپنے ایک عزیز کی یاد آئی اور میں اس محلے کی طرف جسے ایک پرانے محل میں آباد ہونے کی وجہ سے شیش محل کہا جاتا تھا، یہ سوچ کر چل پڑا کہ شاید اس طرف بھائی کی کوئی خبر ملے۔ میں اس محلّے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اُسی علاقے میں رہنے والی ایک خاتون نے مجھے دیکھ کر آہستہ سے

میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میں مڑا تو انھوں نے نقاب کو ذرا سا اُلٹ کر مجھ سے پوچھا:

''پہچانا؟''

''نہیں۔'' میں نے پہچانے بغیر انھیں سلام کرتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا: ''بتائیے، کون ہیں آپ؟''

''میں ہوں قیصر۔ یاد نہیں۔ ہر محرم میں تمہارے گھر کئی بار آتی تھی۔ وہیں سے ساری زیارتیں کرنے جاتی تھی۔''

''ہاں۔ قیصر خالہ۔'' میں نے قیصر پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یاد آ گیا۔ آداب.....'' اب کی میں نے انھیں پہچان کر سلام کیا۔

''جیتے رہو۔'' انھوں نے بڑی محبت سے کہا۔

''آپ یہیں رہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ یہیں رئیس منزل میں۔'' پھر بولیں: ''پرسوں تمہارا بڑا والا بھائی ملا تھا۔''

''کہاں؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔ ''اُنھیں کو تو ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''میاں الماس کے امام باڑے میں۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بڑے افسوس کے ساتھ بولیں:

''بہت دبلا ہو گیا ہے بیچارا۔ لیکن باتیں اب بھی وہی بہکی بہکی کرتا ہے۔'' پھر کہا:

''اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے۔ باجی کی روح تڑپتی ہوگی۔'' انھوں نے ماں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنی زندگی میں تو انھوں نے سب کو اپنے ساتھ رکھا۔''

یہ کہنے کے بعد پوچھا: ''منجھلا کہاں ہے؟''

''سعادت گنج میں۔''

''شادی کی؟''

''کر لی۔''

''اور تم نے؟''

''ابھی نہیں۔''

''اچھا تو جب بھی کرنا ایسی بیوی لانا جو کنبہ جوڑ سکے۔'' انھوں نے ناصحانہ انداز میں کہا پھر بولیں: ''اور بڑے کو اپنے ساتھ رکھنا۔ اس کی شادی تو ہوگی نہیں۔''

پھر ماں کی بہت سی باتیں آنسو پونچھ پونچھ کر یاد کرتی رہیں، باتیں کرتے کرتے جب بہت دیر ہوگئی تو گھبرا کر بولیں: ''راستے بیچ کھڑے کھڑے کیا باتیں کریں۔ کبھی گھر آؤ، بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' پھر چلتے چلتے کہا: ''باجی کی قبر پر جاتے رہا کرو۔''

●

میاں الماس کا امام باڑہ شیش محل سے بہت دور نہیں تھا۔ قیصر خالہ سے بھائی کا پتہ معلوم ہو جانے کے بعد مجھے ان سے ملنے کی بے چینی بہت تھی لیکن پہلے میں اپنے عزیز سے ملنے شیش محل گیا۔ ادھر میرا آنا برسوں بعد ہوا تھا۔ محل کے احاطے میں داخل ہوتے ہی ایک بات مجھے کھٹکی۔ محل کا دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور جب میں محل کے اصل حصے میں داخل ہوا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ شاہی زمانے کی عمارتوں کی جگہ اب ہر طرف نئی طرز کے پکے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ اصل محل کا بس ایک آدھ حصہ باقی رہ گیا تھا جسے دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ محل کا بقیہ حصہ کس طرح کا رہا ہوگا۔ محل کے اندر والے حصے میں ایک بڑا شاہی تالاب تھا جس کے دوسری طرف کا علاقہ غیر آباد تھا۔ اس تالاب میں محل کے اصل مکین شغل کے طور پر گھنٹوں بیٹھ کر مچھلی کا شکار کھیلا کرتے تھے اور کبھی کبھی یہاں پیراکی کے مظاہرے بھی ہوتے تھے لیکن اب تالاب کا پانی بہت گندا ہو چکا تھا اور اس کے چاروں طرف پختہ عمارتیں بن چکی تھیں۔ مجھے اپنے عزیز کا مکان ڈھونڈنے میں بہت دشواری ہوئی۔ مکان اپنی پرانی جگہ پر تھا لیکن نئے مکانوں کے جنگل میں چھپ گیا تھا۔ مکان کیا ایک پوری حویلی تھی جس کے بہت پرانے اور بہت بڑے دروازے پر لوہے کی ایک بڑی اور وزنی زنجیر لٹک رہی تھی۔ میں نے اسی زنجیر کو ہلا کر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے زنجیر پھر ہلائی لیکن پھر کوئی جواب نہیں ملا۔ مجھے زنجیر کھنکھٹاتے ہوئے دیکھ کر ادھر سے گزرنے والے ایک شخص نے کہا:

''ڈیوڑھی کے اندر جا کر پکاریے، میر صاحب سو رہے ہوں گے۔''

''کوئی اور نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی نہیں، اکیلے ہیں۔''

میں نے زور لگا کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا، پھر اندر داخل ہو کر آواز لگائی، پھر دروازے کو اسی طرح بند کر کے باہر انتظار کرنے لگا۔ اب کی اندر سے آواز آئی:

''کون؟''

''میں ہوں......''

عزیز نے ڈیوڑھی میں آ کر دروازہ کھولا لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکے۔ ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے پھر کچھ کچھ پہچانتے ہوئے کہا:

''تم..........!''

''جی عالیہ بیگم کا چھوٹا لڑکا۔''

''ناصر...؟''

'ناصر نہیں ذاکر۔''

''تو ناصر بڑے والے کا نام ہوگا۔''

''جی ہاں۔''

''آؤ آؤ......اندر آؤ۔'' وہ مجھے ڈیوڑھی سے گھر کے اندر لے گئے اور دالان میں پڑے ہوئے ایک تخت پر بٹھاتے ہوئے بولے: ''اپنی ماں کے ساتھ آتے تھے۔ اکیلے تو پہلی بار آئے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''مکان یاد رہا؟''

''یاد تو رہا، لیکن بڑی مشکل سے ملا۔''

''ہاں، سب طرف تو مکان بن گئے ہیں، باہر نکلو تو نئی نئی صورتیں نظر آتی ہیں۔''

پھر بولے:

''گنتی کے شناسا رہ گئے ہیں۔ کچھ محل کے اندر ہیں، کچھ محل کے باہر۔ انھیں سے

سلام دعا ہو جاتی ہے۔'' پھر آگے کہا:

''محل کے اندر اور باہر ساری زمینیں بک چکی ہیں۔'' پھر غصے سے بولے:

''حد تو یہ ہے کہ محل کے دروازے کا بھی سودا ہو گیا۔''

اور اس وقت مجھے خیال آیا کہ محل کے اندر داخل ہوتے وقت مجھے دروازہ کیوں نظر نہیں آیا۔ عزیز بولے جا رہے تھے اور میں ان کے حویلی نما مکان کا جائزہ لے رہا تھا جس میں بڑے بڑے دالان تھے، صحنچیاں تھیں، شہ نشینیں تھیں اور ایک بہت بڑا چبوترہ۔ اسی چبوترے سے متصل ایک چھوٹا سا حوض تھا جو خالی تھا اور جس کی دیواروں پر جمی ہوئی کائی سوکھ چکی تھی۔ کمروں اور دالانوں کی دھنیاں پرانی ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھیں اور ان کے نیچے اُڑانے لگائے گئے تھے تاکہ دھنیوں کے ٹوٹنے سے چھت بیٹھ نہ جائے۔ صحن بہت بڑا تھا لیکن اس کے بیشتر حصے میں ان دیواروں کا ملبہ تھا جو کمزور ہو ہو کر گرتی جا رہی تھیں۔

محل کے بارے میں بہت کچھ بتا کر عزیز کو میری خاطر کا خیال آیا۔ اور تب انھوں نے صحنچی میں رکھے ہوئے نعمت خانے میں سے برفی کی کچھ ڈلیاں نکال کر انھیں ایک طشتری میں رکھا، پھر دالان میں رکھی ہوئی صراحی سے ایک کٹورے میں پانی انڈیلا اور دونوں چیزیں میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا: ''کھاؤ''۔

''ممانی........؟'' میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''برسوں بعد آئے ہو۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بولے: ''مر چکیں، پانچ سال ہوئے۔''

پھر اپنے بچوں کے نام لیتے ہوئے بولے: ''سب باہر ہیں۔ اتنے بڑے مکان میں اکیلا ہوں میں۔''

ابھی ان کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے ان کا نام لے کر آواز لگائی۔ عزیز نے باہر جا کر دروازہ کھولا اور ایک ادھیڑ عمر شخص کو اپنے ساتھ لے کر اندر آئے۔ اس شخص نے تخت پر بیٹھتے ہی میری طرف اس طرح دیکھا جیسے جاننا چاہ رہا ہو میں کون ہوں۔

''بھانجا ہے رشتے کا۔'' عزیز نے اس شخص سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''چچا۔ بات اب آخری مرحلے میں ہے۔'' آنے والا شخص بولا۔ ''کسی دن بیٹھ جایئے تو معاملات طے کر لیے جائیں۔''

''آدمی بھروسے کا ہے''؟ عزیز نے پوچھا

''بالکل۔ میری ذمہ داری سولہ آنے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ لے آؤ کسی دن۔'' عزیز نے کہا۔ پھر پوچھا: ''کتنا دے رہا ہے۔''

''آمنے سامنے بات کر لیجئے۔ ٹھیک رہے گا۔'' آنے والا بولا۔ پھر بولا:

''نئی عمارت میں ایک فلیٹ آپ کو بھی دے گا، اس کے پیسے اصل قیمت سے گھٹا دیے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے تو اتوار کو لے آؤ۔'' عزیز نے کہا۔

آنے والا چلنے لگا تو عزیز نے برفی کی طشتری اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''ایک ڈلی تو کھالو۔'' آنے والے نے طشتری میں سے ایک ڈلی اٹھائی اور اسے مونہہ میں ڈال کر ڈیوڑھی کی طرف چل دیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد عزیز نے مجھ سے پوچھا:

''اب بتاؤ کیسے آنا ہوا؟ ادھر ادھر کی باتوں میں پوچھنا ہی بھول گیا۔''

''ہمارے بڑے والے بھائی جو ذرا......''

''ہاں...وہ کیسا ہے.....کچھ ٹھیک ہوا۔؟''

''نہیں۔''

''ابھی بھی وہی پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''جی.....کبھی ٹھیک ہو جاتے ہیں، کبھی بہت زیادہ بہک جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم لوگ رہتے کہاں ہو؟'' عزیز نے پوچھا۔ ''مکان تو چلا گیا تھا مہاجن کے پاس۔''

''سب الگ الگ رہتے ہیں۔''

''بڑا والا کہاں ہے؟''

''انھیں کو ڈھونڈنے نکلا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی طرف آ رہا تھا تو رئیس منزل سے پہلے ماں کی ایک جاننے والی مل گئیں، انھوں نے بتایا کہ میاں الماس کے امام باڑے میں ہیں۔''

''تو یہاں سے وہیں جاؤ گے۔''

''جی۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ عزیز مجھے ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئے اور جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو انھوں نے ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے کہا: ''آتے رہنا۔'' پھر بولے: ''ہوسکتا ہے یہ مکان تمہیں یہاں نہ ملے، لیکن میں یہیں ملوں گا۔''

●

عزیز کے مکان سے نکل کر میں حسین آباد والی سڑک پر آیا پھر داہنی جانب مڑ کر چھوٹے امام باڑے پہنچا، وہاں سے جامع مسجد کے پیچھے والی گلی کی طرف مڑا۔ گلی پار کرتے ہی اس سڑک پر آنکلا جس کے دوسری طرف نشیب میں میاں الماس کا امام باڑہ تھا۔

ڈھلان سے اتر کر میں امام باڑے کے پھاٹک پر آیا۔ امام باڑے کے چاروں طرف محنت مزدوری کرنے والوں کی گھنی آبادی تھی۔ ان سب نے امام باڑے کے اطراف میں ایک کے بعد ایک اپنے گھر اس طرح بنا لیے تھے کہ امام باڑے کی چہار دیواری نظر نہیں آتی تھی۔ پھاٹک سے گزر کر میں امام باڑے کے اندر پہنچا تو دیکھا کہ وہاں بھی اچھے خاصے لوگ صحنچیوں میں آباد ہیں۔ امام باڑے کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اُس کے گنبدوں پر گھاس اگی ہوئی تھی اور دیواروں کا پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ جانے کی وجہ سے ان کی اینٹیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ دیواروں کی کارنسوں پر قرآنی آیات کی خوبصورت خطاطی قریب قریب مٹ چکی تھی۔ ستونوں اور محرابوں کی نقاشی بھی نام کو باقی رہ گئی تھی۔ امام باڑے سے متصل مسجد کے حوض میں ادھر اُدھر کا جھاڑ جھنکاڑ بھرا تھا اور اس کے ہال میں جگہ جگہ جالے لگے ہوئے تھے اور جھاڑ فانوس کے نام پر زنگ لگی ہوئی کچھ زنجیریں چھتوں سے لٹک رہی تھیں۔

میں امام باڑے کے چبوترے پر کھڑا صحنچیوں پر نگاہ ڈال رہا تھا کہ کسی طرف سے آواز آئی:

''میں یہاں ہوں اِدھر۔''

میں نے اس طرف، جدھر سے آواز آئی تھی نظر اٹھائی تو دیکھا کہ بھائی ایک صحنچی میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے بیچ رحل پر قرآن کھولے بیٹھے ہیں اور سب بچوں کے ہاتھوں میں

سپارے ہیں۔ میں صحنچی میں داخل ہوا تو انھوں نے قرآن بند کر کے جزدان میں رکھا اور اسے رحل پر رکھ کر صحنچی میں بنے ہوئے طاقوں میں سے ایک طاق پر رکھ دیا۔ پھر بچوں سے بولے:

''جاؤ اب کل آنا۔''

بچوں کے جانے کے بعد انھوں نے اس چٹائی پر جس پر وہ خود بیٹھے ہوئے تھے، مجھے بٹھاتے ہوئے کہا:

''تو پتہ لگا لیا تم نے میرے ٹھکانے کا۔''

''ماں کی ایک جاننے والی ملی تھیں آج، رئیس منزل کے پاس۔''

''ہاں...... ہاں۔ پرسوں آئی تھیں یہاں، اپنے کسی عزیز سے ملنے۔'' انھوں نے میری بات ختم ہونے سے پہلے کہا۔ پھر بولے: ''میرے پاس بھی دیر تک بیٹھیں، پرانی باتیں یاد کرتی رہیں۔ تمھیں اور منجھلے کو پوچھ رہی تھیں۔'' پھر ذرا رک کر بولے:

''اب بتاؤ کیوں آئے ہو؟''

''آپ کو لینے۔'' یہ سنتے ہی انھوں نے تیوریوں پر بل دیتے ہوئے کہا:

''میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

''یہاں..... اتنی سی جگہ....''!

''ہر طرح کا آرام ہے یہاں۔'' وہ بولے۔ پھر کہا: ''بچے دوڑ دوڑ کر کام کرتے ہیں۔''

''کھانا پینا......''؟ میں نے پوچھا۔

''کبھی باہر سے منگا لیتا ہوں۔ کبھی یہیں والے، ان بچوں کے والدین پکا دیتے ہیں۔''

''آپ بچوں کو قرآن پڑھا رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں کیوں؟''

''آپ تو عیسائی....''

''ہو گیا تھا، کچھ دن کے لیے۔'' انھوں نے کہا۔ پھر ہنستے ہوئے بولے:

''میاں سب سے اچھا اپنا مذہب ہے، اسلام۔'' پھر پوچھا: ''یہاں پہلی بار آئے ہو؟''

''ہاں۔''

''امام باڑہ دیکھا؟''

''دیکھا، لیکن بڑی بری حالت میں ہے۔''

''ہاں، کوئی ٹھیک سے دیکھ بھال نہیں کرتا۔''

''متولّی؟''

''ہے، اسی نے تو پیسے لے لے کر چاروں طرف سب کو بسایا ہے۔'' پھر غصے سے بولے:

''جھاڑ فانوس، علم پنکھے سب بیچ کھائے۔'' پھر ایک زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

''اماں یہ میاں الماس بھی خوب تھے۔''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔''

''کہیں سے شاہی امام باڑہ لگتا ہے یہ؟ آصف الدولہ کے کہنے پر بنوایا تھا۔'' پھر میرا ہاتھ پکڑ کر صحنچی سے باہر نکلے اور امام باڑے کے گنبدوں، محرابوں اور ستونوں کو دکھاتے ہوئے بولے:

''کسی چھوٹے موٹے رئیس کا امام باڑہ معلوم ہوتا ہے۔'' پھر اچانک بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا:

''ماں کو ساتھ نہیں لائے۔''

''وہ مر چکی ہیں، آپ کو یقین نہیں آتا۔''

''بھول جاتا ہوں، پچھلی جمعرات کو گیا تھا اس کی قبر پر، قرآن پڑھا بیٹھ کر بڑی دیر تک۔''

میں امام باڑے کے چبوترے پر کھڑا بھائی کی باتیں سن رہا تھا کہ ایک بچے کی آواز آئی:

''مولی صاحب! چائے لا رہے ہیں۔''

اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک بچہ دو معمولی سی پیالیوں میں چائے لے آیا، ساتھ میں تام چینی کی پلیٹ میں کچھ نمک پارے بھی تھے۔

''پیو''۔ بھائی نے چائے کی ایک پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہی میں نے منہ بناتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھا۔

''نمک والی ہے۔'' بھائی نے کہا۔ ''میں یہی پیتا ہوں۔''

''تو کیا سوچا آپ نے؟'' چائے ختم ہوتے ہی میں نے بھائی سے پوچھا۔

''کس بارے میں؟''

''میرے ساتھ رہنے کے۔''

''کہا تو، میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

میں سمجھ گیا کہ بھائی میرے ساتھ نہیں آئیں گے، اس لیے میں نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔ چبوترے پر کھڑے کھڑے انھوں نے بہت سی باتیں کیں۔ منجھلے سے وہ ہمیشہ ناراض رہتے تھے لیکن ان کی بیوی بچوں کے بارے میں ضرور پوچھتے رہتے تھے۔ آج بھی انھوں نے ان سب کی خیریت معلوم کی۔ باتیں کرتے کرتے جب کافی دیر ہوگئی تو بولے:

''اب جاؤ، شام ہونے والی ہے، گھر یہاں سے کافی دور ہے۔'' پھر امام باڑے کی مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''مجھے بھی نماز کے لیے جانا ہے۔ آج کل امامت میں ہی کر رہا ہوں۔''

چلتے وقت میں نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر بھائی کو دیتے ہوئے کہا:

''اور لے لیجیے گا ضرورت پڑنے پر۔''

روپے لے کر بھائی مسجد کی طرف چلے گئے اور میں امام باڑے سے نکل کر اپنے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔ لیکن سڑک پر آنے کے بجائے میں نے وہ راستہ اختیار کیا جو سرائے معالی خاں کے منہ پر نکلتا تھا۔ اس راستے سے گزرتے ہوئے وہاں جہاں سے سرائے معالی خاں کا اصل علاقہ شروع ہوتا تھا، مجھے ایک پرانی حویلی نظر آئی جس کا بیشتر حصہ کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا اور اب اس کے وسیع اور کشادہ صحن کو لوگوں نے عام راستہ بنا لیا تھا۔ اپنے راستے کو اور مختصر کرنے کے لیے میں بھی اسی عام راستے پر ہولیا۔ اس راستے سے گزرتے وقت میں نے دیکھا کہ لوگوں نے حویلی کے صحن اور احاطے میں پختہ مکان بنا لیے ہیں لیکن کچھ حصے ایسے بھی تھے جن پر ابھی کوئی نئی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ انھیں حصوں میں وہ پرانی شہتیریں بھی نظر آئیں جو چھتوں کے ڈھ جانے کے باوجود ان دیواروں پر ٹکی ہوئی تھیں جو کسی بھی وقت گر سکتی تھیں۔ حویلی سے نکلتے نکلتے میرے حافظے میں اک کوندا سا لپکا:

''ایسی حویلی کا حال میں نے کہیں پڑھا ہے۔''

''کہاں پڑھا ہے؟'' خود سے سوال کرتے ہوئے میں نے حافظے پر زور دیا۔

اور تب مجھے خیال آیا کہ ماں کی جمع کی ہوئی کتابوں میں کچھ کتابیں مرزا رسوا کی بھی تھیں۔ ماں کو اچھی کتابیں پڑھنے اور انھیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ انھیں کتابوں میں سے 'زہرِ عشق' اور 'امراؤ جان' میں نے ماں کی آنکھ بچا کر نکالی تھیں اور انھیں چھپ کر پڑھا تھا اور جب ان کتابوں کو واپس رکھنے گیا تھا تو ایک اور کتاب پر نظر پڑی تھی۔ اٹھا کر پڑھنا شروع کی تو اچھی لگی، اسی کتاب میں مرزا رسوا نے سرائے معالی خاں کی ایک حویلی کا ذکر کیا تھا۔ اس کتاب کی اور کتاب میں حویلی کے بیان کی یاد آتے ہی میں نے حویلی کے بچے کھچے آثار کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ حویلی کی شکستہ دیواروں، آدھی سے زیادہ ڈھ جانے والی چھتوں، اس کے صحنوں اور دالانوں میں بنے ہوئے نئے اور پختہ مکانوں کو دیکھ کر میں نے سوچا:

''یہیں کہیں کسی حصے میں 'اختری بیگم' رہتی ہوگی۔''

گئے زمانے کی حویلی میں اختری بیگم کے رہنے کی جگہ کے بارے میں سوچتا ہوا میں حویلی کے آخری حصے پر آیا تو دیکھا کہ اس کی ڈیوڑھی اور پھاٹک کے نشانات ابھی باقی ہیں۔ ڈیوڑھی کی چھت گر چکی تھی لیکن دونوں طرف کی صحنچیاں اور ان کے اوپر کے حصے اپنی مخدوش حالتوں کے باوجود اپنی جگہ موجود تھے جن میں کچھ مفلوک الحال خاندانوں نے اپنے ٹھکانے بنا لیے تھے۔

حویلی سے باہر نکلتے نکلتے میں نے سوچا: ''کمال کا آدمی تھا یہ مرزا رسوا بھی۔ یا تو اس نے یہ حویلی دیکھی تھی اور اس کا ہو بہو نقشہ پیش کر دیا تھا یا اس نے اپنی تخئیل سے ایسی حویلی کا نقشہ کھینچا تھا جو ہو بہو یہی حویلی معلوم ہوتی ہے۔''

یہی سوچتے سوچتے میں مختصر راستوں سے ہوتا ہوا اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

●

بھائی سے ملنے کے بعد کئی دن تک میں انھیں کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی کہ اب جب میں اچھی خاصی کمائی کرنے لگا تھا، وہ مجھ سے الگ رہیں۔ مجھے یہ بھی سوچ کر تکلیف ہوتی تھی کہ ان کے الگ رہنے سے لوگ سوچتے ہوں گے کہ میں ان

کے خلل کی وجہ سے انھیں اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔ اور اس وقت تو یہ تکلیف اذیت میں بدل جاتی جب راہ چلتے کوئی عزیز یا شناسا ان کے بارے میں پوچھتا اور اُسے بتانا پڑتا کہ وہ کہاں رہ رہے ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ مجھے خود نہیں معلوم ہوتا کہ بھائی کہاں رہ رہے ہیں۔

ایسے موقعوں پر مجھے بہت کچھ سننا پڑتا۔ لوگ کہتے:

''اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے۔''

''اب تو کھلا سکتے ہو اسے۔''

اور میں خاموش رہ کر سب کچھ سنتا رہتا۔ دوسروں کو یہ یقین دلانا بہت مشکل تھا کہ بھائی اپنے سودائی مزاج کی وجہ سے کسی ایک جگہ پر بہت دنوں تک نہیں رہ سکتے۔ ٹھکانے بدلنا اور بدلے ہوئے ٹھکانوں پر زیادہ دنوں تک نہ رہنا ان کی عادت بن چکی تھی۔

●

ایک دن منجھلے کے گھر سے بلاوا آیا کہ آج ماں کا فاتحہ ہے۔ منجھلے سال میں ہر تیسرے ماہ کے آخری پنجشنبے کو ماں کا فاتحہ کراتے تھے۔ میں شام کو منجھلے کے گھر پہنچا تو ماں کے بہت سے عزیز جمع تھے۔ میرے وہاں پہنچتے ہی عزیزوں نے بھائی کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا:

''بڑے کہاں ہیں، بہت دنوں سے دکھائی نہیں دیے۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے کہا۔

''کوئی کہتا تھا بمبئی چلے گئے۔'' دوسرا عزیز بولا۔

''دو مہینے پہلے حسین آباد کی طرف نظر آئے تھے۔'' منجھلے کے کسی دوست نے جو فاتحہ میں شریک ہونے کے لیے آیا تھا، کہا۔

منجھلے جو دور بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے، بولے: ''بمبئی چلے گئے تھے لیکن اب واپس آ گئے ہیں۔''

فاتحہ کے بعد عزیزوں نے بہت دیر تک ماں کی باتیں کیں اور بہت دیر تک انھیں یاد کیا۔

''ہمارا قرآن انھوں نے ہی ختم کرایا تھا۔'' ماں کی ایک دور کی بھتیجی نے کہا۔

''اور تم سے چھوٹی والی کی بسم اللہ بھی انھوں نے ہی کرائی تھی۔'' بھتیجی کی ماں نے

اسے یاد دلایا۔ ایک اور خاتون جنہیں منجھلے نے ہماری خالہ زاد بہن بتایا تھا بولیں:

''آج جو ہم اتنی اچھی اردو لکھ بول لیتے ہیں، یہ انھیں کی دین ہے۔''

پھر وہ سب بتاتے رہے کہ کس طرح ماں سب کے مرنے جینے میں شریک رہتی۔ آدھی رات کو بھی مصیبت میں کوئی بلانے آتا تو برقع سر پر ڈال کر چل دیتی۔ ایک بی بی نے جنھوں نے ابھی تک نقاب چہرے سے نہیں ہٹائی تھی منجھلے کی بیوی کا بازو پکڑتے ہوئے ان کے کان میں کہا:

''میری بہو کو نواں مہینہ تھا، اچانک درد اٹھے، بستر پر تڑپ رہی تھی، میرے تو ہاتھ پیر پھول گئے، تمہاری ساس کے پاس دوڑی دوڑی گئی۔ وہ اسی وقت ایک دائی کو بلا کر لائیں اور بہو کی مشکل کو آسان کیا۔''

ایک اور معمر خاتون جو اسی کے پیٹے میں تھیں، نحیف سی آواز میں بولیں:

''اور مسئلے مسائل سے بھی خوب واقف تھیں۔''

ایک اور عزیزہ جن کا تعلق ہمارے آبائی محلے سے تھا، اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں:

''ہمارے محلے کی عزاداری انھیں کے دم سے تھی۔''

میں اور منجھلے ماں کے بارے میں سب کی باتیں سنتے رہے۔ بیچ بیچ میں بھائی کا بھی ذکر آتا رہا۔ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سوچا کہ جمعرات کا دن ہے، اس طرف آیا ہوں تو درگاہ بھی ہولوں۔ منجھلے کے گھر سے درگاہ بہت دور نہیں تھی، مشکل سے ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ میں یہ فاصلہ طے کر کے درگاہ پہنچا تو اس کے دروازے پر ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک صاحب جن کی ڈاڑھی اور سر کے بال بہت بڑھے ہوئے تھے، عمامہ سر پر رکھے سیاہ عبا پہنے ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں حاضریاں لیے کھڑے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے ان کے گرد حلقہ بنائے ہاتھ بڑھا بڑھا کر چلا رہے ہیں:

''جناب......جناب........ادھر، ہمیں......ہمیں نہیں ملی۔''

پھر دیکھا کہ کچھ اور بچے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں اور کہتے جا رہے ہیں:

''جناب حاضری بانٹ رہے ہیں۔''

میں ان صاحب کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ کوئی اور نہیں بھائی ہیں۔ میں نے یہ بھی

دیکھا کہ ان کے گلے میں ایک حتی بھی تنگی ہوئی ہے۔ جس پر بہت عمدہ خط میں ان کا نام لکھا ہے اور اسی کے آگے لکھا ہے: مجتہد العصر۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے جلدی جلدی بچوں میں حاضریاں تقسیم کیں پھر مجھے گھورتے ہوئے کہا: ''تمھیں کیسے معلوم میں یہاں ہوں۔''

''میں آپ کو ڈھونڈتا ہوا نہیں آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''منجھلے کے یہاں آیا تھا۔ آج ماں کا فاتحہ تھا، وہاں سے ادھر آ گیا۔ سوچا علم کی زیارت کرتا ہوا گھر جاؤں۔''

''منجھلے کو یاد رہتی ہے ماں؟'' انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہر تیسرے مہینے کراتے ہیں فاتحہ، آپ کو نہیں معلوم۔''

''کبھی بتایا نہیں اس نے۔''

''کوئی مستقل ٹھکانہ ہو آپ کا تو بتایا جائے۔'' میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ پھر انھیں تاکید کرتے ہوئے کہا: ''آپ یہیں رہیے، میں علم چوم کر آتا ہوں۔''

درگاہ کے اندر جانے سے پہلے مڑ کر میں نے ایک بار پھر کہا: ''جایئے گا نہیں۔''

علم کی زیارت کے بعد میں درگاہ سے باہر آیا تو بھائی وہیں کھڑے تھے جہاں میں انھیں چھوڑ کر گیا تھا۔

''چلیے۔'' میں نے ان سے کہا۔

جب ہم درگاہ کے احاطے سے باہر نکل آئے تو میں نے ذرا سخت لہجے میں ان سے کہا:

''یہ کیا بھگل بنائے رہتے ہیں آپ۔''

''کیوں؟ مجتہد ہونا کوئی جرم ہے۔؟''

''کس نے بنایا آپ کو مجتہد؟''

''بنانے سے نہیں بنتا کوئی۔'' انھوں نے کہا: ''مذہب کے بارے میں میں ان مولویوں سے زیادہ جانتا ہوں۔''

درگاہ سے نکل کر تنگ اور مختصر راستوں سے ہوتے ہوئے ہم نخاس کی طرف نکل آئے۔ یہاں میں ایک ہوٹل کی طرف بڑھنے لگا تو بھائی نے مجھ سے پوچھا: ''کہاں لے جا رہے ہو؟''

''آپ بھوکے ہیں، کھانا کھا لیجیے۔ میں منجھلے کے یہاں سے کھا کر آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

بھائی خاموش رہے۔ ہوٹل میں بیٹھ کر میں نے ان کی پسند کی چیزیں منگوائیں۔ انھوں نے جی بھر کر کھایا۔ میں انھیں اس طرح کھاتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ انھیں کئی دن سے پوری غذا نہیں ملی ہے۔ بھائی کے کھانا کھا چکنے کے بعد جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو میں نے ان سے کہا:

''پیسے لے کر میاں الماس کے امام باڑے گیا تھا، پچھلے مہینے۔ لوگوں نے بتایا کہ آپ نے وہ جگہ چھوڑ دی ہے۔''

''اب یہ پوچھو گے کہ آج کل کہاں ہوں؟''

''بتا دیں تو اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر بگڑتے ہوئے کہا: ''لوگ آپ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ میں نہیں بتا پاتا تو کہتے ہیں: ''بھائی کی خبر نہیں رکھتے۔''

بھائی یہ سن کر مسکرائے لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ رہ کہاں رہے ہیں۔

ہوٹل سے نکل کر جب میں گھر والی سڑک پر آیا تو انھوں نے پھر پوچھا: ''کدھر لیے جا رہے ہو؟''

''گھر۔'' میں نے کہا۔ ''اب میرے ساتھ رہیے، آپ کا سامان جہاں ہے، کل وہاں سے لے آؤں گا۔''

بھائی کچھ نہیں بولے۔ کمرے پر ہم دونوں دیر رات تک باتیں کرتے رہے۔ بھائی کا حافظہ بہت اچھا تھا، اس رات انھوں نے ماں کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں:

''جانتے ہو؟'' انھوں نے کہا۔ ''جب ہمارے گھر کی وہ دیوار گری تھی جو گولر والے مکان کی طرف تھی تو ماں نے لکھوریاں جمع کر کے پوری دیوار خود اٹھائی تھی اور اس پر مٹی اور چونے کا پلاستر کیا تھا۔'' پھر بتایا: ''اور محرم میں وہ پورے گھر میں چونا خود پوتی تھی اور ہمارے یہاں بقرعید کی اُنتیس کو علم کھڑے ہو جاتے تھے اور ماں رات بھر امام باڑہ سجاتی تھی اور بہت پہلے سے علم پٹکے نکال کر رکھ لیتی تھی اور ایک ایک علم اور ایک ایک پٹکے کو دیکھتی اور کسی علم پر قلعی کی ضرورت ہوتی تو قلعی کراتی، اگر کسی پٹکے پر لچکا لگانا ہوتا تو دن دن بھر بیٹھ کر لچکا لگاتی اور پہلی محرم کو تعزیہ لا کر امام باڑے میں رکھ دیتی۔ اس محلّے میں سب سے پہلے ہمارا امام باڑہ سجتا تھا۔'' بتاتے بتاتے اچانک بولے:

''جن لوگوں نے مادھو مہاجن سے ہمارا مکان خریدا ہے، وہ لوگ اندر والے حصے

میں امام باڑہ سجاتے ہیں؟''

''ان لوگوں نے مکان کا پورا نقشہ بدل دیا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا!!!''۔ انھوں نے اس لفظ کو یوں ادا کیا جیسے اُنھیں نقشہ بدل جانے کا دکھ ہوا ہو۔

''آپ پلٹ کر اس طرف کبھی گئے بھی؟''

''جی نہیں چاہتا اُدھر جانے کو، چار پانچ سال پہلے گیا تھا، چھوٹے مکان والوں کی خیریت لینے۔'' انھوں نے ہمارے ماموں کے مکان کا ذکر کرتے ہوئے کہا جو ہمارے مکان کے بغل میں تھا۔ پھر بولے:

''اس وقت تک ڈیوڑھی سلامت تھی اور باہر کی طرف کے دونوں کمرے بھی۔''

''ان لوگوں نے پورا مکان تڑوا کر اسے پھر سے بنوایا ہے۔'' میں نے کہا۔

یہ سن کر بھائی تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے پھر انھیں جماہیاں آنے لگیں۔

''اب سوئیے۔'' میں نے کہا۔ بھائی میرے ساتھ تخت پر سونے کے لیے لیٹ گئے اور لیٹتے ہی ان کی آنکھ لگ گئی۔ میں دیر تک جاگتا رہا۔ بھائی نے اتنی دیر تک گھر کی باتیں کی تھیں کہ سوتے سوتے میری آنکھوں میں گھر کا پورا نقشہ گھومنے لگا، اور پھر میں نے خواب میں دیکھا:

تیز گرمی میں میں اپنے گھر کی ڈیوڑھی کے دونوں دروازے کھولے وہاں پڑے تخت پر لیٹا ہوں اور ڈیوڑھی کے دروازوں کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کا لطف لے رہا ہوں۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں گھر کے صحن میں ہوں۔ اس کی چوڑی اینٹیں اب بھی کہیں کہیں سے اکھڑی ہوئی ہیں اور میرے لگائے ہوئے پودے اب بھی اسی کیاری میں لگے ہیں جسے میں نے اینٹیں رنگ کر بڑے جتن سے بنایا تھا۔ میں نے اپنے لگائے ہوئے امرود کے پیڑ سے امرود توڑ کر کھائے اور اس حمام میں جھانکا جو تین طرف سے بند اور ایک طرف سے کھلا رہتا تھا اور جس کے نل میں پانی کبھی کبھی آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ماں صحن کے دوسرے نل سے بالٹیاں بھر بھر کر وہاں لے جا رہی ہے اور مجھے بلا کر اپنی کھلی ہوئی پیٹھ کو جھانوے سے ملوا کر اس کا میل چھڑوا رہی ہے۔ پھر میں نے ان ڈھابلیوں کو دیکھا جن میں ہمارے کرائے دار نے کبوتروں کو لا کر پالا تھا۔ ان میں سے کچھ دانہ چگ رہے تھے، کچھ ڈھابلیوں پر بیٹھے تھے اور کچھ صحن کے بائیں طرف کی اونچی دیوار پر۔ اور ایک دو کبوتر ڈھابلیوں کے خانوں میں انڈے سہ

رہے تھے۔ پھر میں دالان سے متصل باورچی خانے میں گیا جہاں ماں بائیس رجب کی نذر کے لیے ٹکیاں تل رہی تھی۔ پھر میں اس کوٹھری میں گیا جس کا روشندان گولر والے مکان کی طرف تھا۔ میں نے کوٹھری میں رکھے ہوئے صندوقوں پر چڑھ کر روشندان سے گولر والے مکان کی طرف جھانکا اور اپنے دوست سیّد کو آواز دی۔ پھر کوٹھری کے مچان پر رکھی ہوئی اپنی لوٹی ہوئی پتنگوں کو گنا اور اُنھیں ماں کے کپڑوں کی ایک گٹھری کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا۔ کوٹھری سے باہر نکل کر میں دالان میں بچھی ہوئی مسہری پر کچھ دیر لیٹا پھر صحنچی میں رکھے ہوئے مرتبان سے کھجوریں نکال کر کھائیں اور اسی مرتبان کے برابر رکھی ہوئی اچاری سے جوزی حلوا سوہن کی ایک دو لوزاتیں نکال کر منہ میں ڈالیں۔ پھر میں ڈیوڑھی کے داہنی طرف والا زینہ چڑھ کر اوپر گیا۔ اوپر والے کرائے دار موزوں کی مشین لگائے موزے بُن رہے تھے۔ وہاں سے میں اپنے دالان والی چھت پر گیا اور چھت پر کی کھڑکی سے پڑوسی کی چھت پر اور وہاں سے ہاتھ بڑھا کر پڑوس میں لگے گولر کے پیڑ کی اس شاخ کو جس پر بہت سے گولر پک چکے تھے اپنی طرف کھینچا اور پکے ہوئے گولر توڑ کر کھانا شروع کر دیے۔ پکے ہوئے گولروں میں سے بھنگے نکل کر ہوا میں اڑ رہے تھے اور مجھے اُن کا ہوا میں اڑنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پڑوسی کی چھت پر سے میں پھر اپنی چھت پر آیا اور زینے سے اترنے کے بجائے سائبان سے پھسلتا ہوا نیچے صحن میں آ کودا۔

●

صبح میری آنکھ کھلی تو بھائی کمرے میں نہیں تھے البتہ جہاں وہ لیٹے ہوئے تھے، وہاں ایک پرچہ رکھا ہوا ملا۔ پرچے میں لکھا تھا:

''اب مجھے تلاش مت کرنا، میں جہاں ہوں ٹھیک ہوں،
مادھو مہاجن نے جن لوگوں کے ہاتھ ہمارا مکان بیچا ہے
میں نے ان سے مکان خریدنے کی بات کی ہے۔ دگنی
قیمت پر راضی ہوئے ہیں۔ بیعانہ دے دیا ہے۔ اگلے مہینے
رجسٹری ہو جائے گی، ماں کے نام۔ زیارتوں سے واپس
آ کر وہ یہیں رہے گی۔ منجھلے کو مت بتانا۔ میاں الماس کا

امام باڑہ پھر سے بنوا رہا ہوں۔ رات دن کام لگا ہے۔
سارے ناجائز قبضے ہٹوا دیے ہیں۔ گھنٹہ گھر کی نیلامی
ہونے والی ہے، اس کے لیے پیسے جمع کر رہا ہوں۔ بولی
والے دن تم بھی آ جانا، اس کے بعد شیش محل بھی خریدنے کا
ارادہ ہے۔ اس کا اصل مالک کون ہے، پتہ چلے تو بتانا۔
مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے، لڈن کی چکی پر رکھوا
دینا، مجھے مل جائیں گے۔ اگلے جمعہ کو آصفی مسجد ضرور آنا
اور میرا خطبہ ضرور سننا۔ سارے مولویوں کی چھٹی کر دوں
گا۔ دم کی چائے ابھی بنائی ہے۔ اٹھتے ہی پی لینا۔
اور ہاں لڈن کی چکی پر پیسے رکھوانا مت بھولنا۔''

تمہارا

بڑا بھائی

پرچہ پڑھنے کے بعد میں کچن میں گیا تو واقعی کیتلی میں دم کی ہوئی چائے رکھی تھی۔
ماں صبح کو ہمیشہ دم کی چائے پیتی تھی اس لیے بھائی کو بھی دم کی چائے کا بہت شوق تھا۔ کیتلی ابھی
گرم تھی جس کا مطلب تھا کہ بھائی میرے اٹھنے سے کچھ ہی دیر پہلے نکلے ہیں۔ میں نے چائے
پی کر بھائی کے خط کو ایک بار پھر پڑھا۔ پھر مجھے اپنے گھر کی چہار دیواری کے وہ منظر یاد آنے
لگے جو پچھلی رات میں نے خواب میں دیکھے تھے۔ میں ان منظروں میں ایسا کھویا کہ وقت کا پتہ
ہی نہ چلا اور جب گھڑی دیکھی تو گھر سے نکلنے کا وقت ہو چکا تھا۔ گھر سے باہر نکلتے ہی میں نے
پہلا کام یہ کیا کہ گلی کے نکڑ پر واقع لڈن کی چکی پر بھائی کے لیے پیسے رکھوا دیے۔ پھر اپنے
کاموں پر نکل پڑا۔ کاموں سے فارغ ہو کر جب شام کو لوٹا تو لڈن نے اطلاع دی کہ بھائی نے
اپنے پیسے منگوا لیے ہیں۔ میں نے لڈن سے یہ نہیں پوچھا کہ پیسے کون لینے آیا تھا اور بھائی کہاں
ہیں۔ اب میں نے بھائی کا خیال چھوڑ دیا تھا۔

●

کئی مہینے بعد ایک دن ایک ملاقاتی نے راہ چلتے مجھے روکا اور علیک سلیک کے بعد پوچھا:

''کیا کر رہے ہو؟''

''نوکری۔''

''کہاں؟''

''دفتر میں، گومتی کے اُس پار۔''

''گومتی پر یاد آیا۔ پرسوں تمہارے بھائی آئے تھے، سب سے بڑے والے۔'' انھوں نے کہا۔ پھر پوچھا: ''کچھ بیمار ہیں کیا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے کہا: ''کچھ مہینے پہلے درگاہ سے اپنے گھر لایا تھا۔ ایک رات رک کے پھر غائب ہو گئے، اب کہاں ہیں، نہیں معلوم۔''

''پرسوں آئے تھے میرے پاس، حالت بہت خراب تھی۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بولے: ''کچھ پیسے لے گئے ہیں مجھ سے، قرض مانگ کر۔''

''کتنے؟ بتا دیجیے، میں آپ کو دے دوں۔''

''نہیں، میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں، انھوں نے لوٹانے کا وعدہ کیا ہے۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بتایا: ''دریا والی مسجد میں ہیں۔ لوگ انھیں کوئی پہنچا ہوا بابا سمجھنے لگے ہیں، کوئی کراماتی بزرگ۔'' انھوں نے آگے بتایا: ''صبح سے شام تک مجمع لگا رہتا ہے، کسی کسی کو کبھی کبھی کچھ بتا دیتے ہیں۔''

میں نے یہ سب سنا اور خاموش رہا۔ ملاقاتی سب کچھ بتا کر آگے بڑھ گئے۔

دریا والی مسجد جہاں بھائی کے ہونے کی اطلاع ملی تھی، بیلی گارد سے رومی دروازے کی طرف جانے والی سڑک پر پکّے پل سے ذرا پہلے گومتی کے کنارے بنی ہے۔ عام لوگوں میں یہ جناتوں والی مسجد کے نام سے بھی مشہور ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں بھائی کو نہیں ڈھونڈوں گا اور بھائی نے بھی کہا تھا کہ انھیں تلاش نہ کیا جائے۔ اس لیے کئی لوگوں سے ان کا ٹھکانہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی میں کبھی مسجد کی طرف نہیں گیا لیکن ایک روز جب میں دفتر سے لوٹ رہا تھا تو مجھے اس سڑک کی طرف مڑنے سے روک دیا گیا جو شاہ مینا کے مزار سے ہوتی

ہوئی نخاس کی طرف جاتی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس طرف بہت زور کا جھگڑا ہو گیا ہے اور یہ جھگڑا کئی محلوں میں پھیل گیا ہے اور جب تک جھگڑے پر قابو نہیں پایا جاتا، یہ راستہ نہیں کھلے گا۔ اب میرے پاس اس سڑک کی طرف لوٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا جو بیلی گارد سے رومی دروازے کی طرف جاتی تھی اور جسے کسی زمانے میں ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا۔ اس سڑک پر میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ میں ادھر سے حسین آباد کی طرف نکل جاؤں گا اور اگر جھگڑا وہاں تک نہیں پھیلا ہوگا تو اپنے کسی عزیز کے یہاں ٹھہر جاؤں گا۔ لیکن ابھی میں اس سڑک پر کچھ ہی دور چلا تھا کہ میں نے دیکھا کہ دریا والی مسجد کے پاس کچھ لوگ جمع ہیں۔ قریب پہنچا تو ان میں کچھ شناسا چہرے بھی نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی ان لوگوں نے کہا:

''یہیں رک جاؤ، اُدھر بہت زور کا جھگڑا ہو رہا ہے۔''

وہ سب مجھے لے کر مسجد کے صحن میں آ گئے اور تب مجھے خیال آیا کہ بھائی تو یہیں رہ رہے ہیں۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن بھائی کہیں نظر نہیں آئے۔ میں نے ایک شخص سے جو مسجد کے اندرونی حصے میں چٹائیاں بچھا رہا تھا، پوچھا:

''آپ یہیں رہتے ہیں؟''

''ہاں۔ کیوں؟''

''ایک اور صاحب بھی یہاں رہتے ہیں......؟''

''رہتے ہیں، لیکن صبح سے نکلے ہوئے ہیں، پرانے لکھنؤ کی طرف گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی تک لوٹے نہیں ہیں، وہاں جھگڑا ہو گیا ہے، پتہ نہیں کہاں پھنسے ہیں۔''

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے اس کے جملے کو دل ہی دل میں دہرایا:

''پتہ نہیں کہاں پھنسے ہیں۔''

مسجد میں مقیم لوگ سمجھ چکے تھے کہ جب تک جھگڑا رک نہیں جاتا اور راستے کُھل نہیں جاتے، اُنھیں اسی مسجد میں ٹھہرنا ہے۔ میں سب کے ساتھ بیٹھا گومتی کے اس کنارے کو دیکھ رہا تھا جہاں بچپن میں میں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ نہانے آیا کرتا تھا اور یہاں پتنگ بازی کا وہ مقابلہ دیکھا کرتا تھا جس میں دور دور سے لوگ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آتے تھے۔

پتنگ بازی کے بہت سے گُر میں نے انھیں مقابلوں میں سیکھے تھے۔اس وقت تک مسجد کے دوسری طرف سے سڑک نہیں نکالی گئی تھی اور دریا کا کنارہ مسجد سے بہت دور نہیں تھا۔ نہانے اور پتنگ بازی کا مقابلہ دیکھنے کے بعد جب ہم تھک جاتے تو اسی مسجد کے صحن میں لیٹ کر گھنے درختوں کے سائے میں آرام کرتے۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو گھنے درخت غائب تھے، سڑک نکالتے وقت انھیں کاٹ دیا گیا تھا۔اب مسجد کے احاطے میں دو۔چار درخت رہ گئے تھے جن کی شاخیں اس حد تک کاٹ دی گئی تھیں کہ زمین ان کے سائے سے محروم ہو گئی تھی۔ مسجد کے اس طرف جدھر سڑک نکالی گئی تھی، ایک گھاٹ تھا لیکن سڑک کو اتنا اونچا کر دیا گیا تھا کہ وہ گھاٹ نشیب میں چلا گیا تھا۔گھاٹ کے آس پاس کچھ عمارتیں بن گئی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ ان عمارتوں کی جگہ پر کیسی چمکتی ہوئی ریت تھی۔ پتنگیں لڑانے والے اسی چمکتی ہوئی ریت پر اپنی دریاں بچھا کر ان پر اپنی چرخیاں اور پتنگیں رکھتے تھے۔اکثر ایسا بھی ہوتا کہ نہانے کے بعد ہم اسی ریت پر لوٹیں کھاتے پھر گومتی کے پانی میں اتر کر بدن سے لپٹی ہوئی ریت چھڑاتے۔ان باتوں کو یاد کرتے کرتے میں نے سوچا کیوں نہ کنارے تک ہو آؤں۔ یہ سوچتے ہی میں مسجد کے صحن سے نکلا، سڑک پار کی اور اس راستے کو تلاش کرنے لگا جس پر چل کر میں کنارے تک پہنچ جاؤں۔ لیکن راستہ کہیں نہیں ملا۔ایک ہی راستہ تھا جو گھاٹ کی طرف جاتا تھا، لیکن میں اس راستے پر نہیں گیا۔ میں نے سوچا کنارا تو وہی ہے جہاں چلتے چلتے پاؤں پانی میں ڈوب جائیں اور اب ایسا کنارا دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔بچپن میں ہم کنارے سے کچھ دور اپنے کپڑے اتارتے اور دوڑتے ہوئے پانی میں اتر جاتے۔گھاٹ پر تو صرف مندر کی برجیوں سے چھلانگ لگانے کے لیئے جاتے۔ جب کنارے کی طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں ملا تو میں مسجد کے صحن میں واپس لوٹ آیا۔صحن میں داخل ہوتے ہی میں نے کسی نئے آنے والے سے کسی کو پوچھتے سنا:

''راستہ کھلا؟''

''نہیں جھگڑا بڑھ گیا ہے۔راستے صبح تک کے لیے بند کر دیے گئے ہیں۔''

''پتہ نہیں کہاں پھنسے ہیں۔'' میں نے بھائی کے بارے میں سوچا۔پھر خیال آیا ایسا ہی ایک جھگڑا اماں کی زندگی میں ہوا تھا اور ماں نے سب سے پہلے بھائی کو باہر نکلنے سے روکا تھا۔

پھر مجھ سے اور منجھلے سے کہا تھا: ''اس پر نظر رکھنا، پتہ نہیں کس طرف نکل جائے اور مار دیا جائے۔''

بھائی، جیسے جیسے نعروں کی آواز بلند ہوتی باہر نکلنے کے لیے بے چین ہو جاتے اور ماں انھیں پکڑ پکڑ کر بٹھاتی اور کہتی: ''تمھیں میری قسم، باہر مت نکلنا۔'' پھر اپنے بھائی کو آواز دے کر بلاتی:

''وجو: خدا کے لیے اسے روکو، پتہ نہیں جنون میں کیا کر بیٹھے۔''

اور ماں کے بھائی جن کی آواز بہت پاٹ دار تھی، گرج کر بھائی سے کہتے:

''خبردار! باہر قدم نکالا تو......'' اور بھائی سہم کر صحنچی میں چلے جاتے۔

یہ سب یاد کر کے میں نے ایک بار پھر بھائی کے بارے میں سوچا: ''پتہ نہیں کہاں پھنسے ہوں گے۔''

رات ہونے لگی تھی۔ مسجد کے صحن میں اچھے خاصے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ انھیں میں سے کوئی ہم سب کے لیے کہیں سے کھانا لے آیا تھا اور اسی کے ساتھ یہ خبر بھی لایا تھا کہ صبح کو بھی راستے نہیں کھلیں گے۔ مسجد میں جمع لوگوں نے نماز پڑھنے کے بعد ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا، پھر مسجد کے صحن میں چٹائیاں بچھا کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ لیکن نیند کسی کو نہیں آ رہی تھی۔ سب کے دل اپنے اپنے علاقوں میں لگے ہوئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ میرا مالک مکان میرے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوگا کہ میں کہاں رہ گیا۔ جھگڑے کے بارے میں ہر نیا آنے والا بتاتا کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے اور جیسے جیسے جھگڑے کے بڑھنے کی خبر ملتی، مجھے بھائی کا خیال ستاتا: ''پتہ نہیں کس حال میں ہیں، کہیں بلوائیوں میں تو نہیں گھر گئے؟'' منجھلے کے بارے میں یقین تھا کہ وہ محفوظ علاقے میں ہیں۔ جب بھائی کے خیال نے مجھے بہت پریشان کیا تو میں نے اس شخص سے جسے میں نے مسجد میں چٹائیاں بچھاتے دیکھا تھا، پوچھا:

''یہ بتا کے گئے تھے کہ پرانے لکھنؤ میں کہاں جا رہے ہیں؟''

''نہیں، وہ جب نکلتے ہیں تو کچھ بتا کر نہیں نکلتے۔''

مسجد کے صحن میں لیٹے ہوئے لوگ بہت دیر تک جاگتے رہے، لیکن جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو وہ سب اپنے متعلقین کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گئے اور مجھے نہیں معلوم کہ پچھلے پہر مجھے کس وقت نیند آ گئی۔ صبح ہم سب کی آنکھ اس وقت کھلی جب اذان کی

آواز ہمارے کانوں میں گئی۔ بیدار ہونے کے بعد مسجد میں جمع لوگ جب صبح کی نماز ادا کر چکے تو موذن نے سب کے لیے چائے بنائی۔ اور جب وہ مجھے چائے دینے کے لیے آیا تو کہا:

''بابا بڑے اہتمام سے چائے بناتے ہیں، اذان بھی وہی دیتے ہیں۔''

''کون بابا؟''

''وہی جن کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے، اسی حجرے میں رہتے ہیں ہمارے ساتھ۔'' اس نے اس حجرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں سے وہ چائے بنا کر لایا تھا۔ پھر پوچھا:

''تم اُن کے بارے میں کیوں پوچھ رہے تھے؟''

''میرے جاننے والے ہیں۔'' میں نے قصداً بھائی سے اپنا رشتہ ظاہر نہیں کیا۔

''کوئی ہے نہیں ان کا، اکیلے ہیں۔'' اس نے کہا۔ پھر بولا: ''آدمی خاندانی معلوم ہوتے ہیں لیکن پوچھنے پر کچھ بتاتے نہیں۔''

''یہاں کب سے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کئی مہینے سے۔ آئے تھے تو صحن میں پڑے رہتے تھے، سامان بہت تھوڑا تھا ان کے ساتھ۔'' اس نے کہا۔ پھر کہا: ''جب تیز جاڑا پڑنے لگا تو میں نے اس ڈر سے کہ کہیں انھیں ٹھنڈ نہ لگ جائے، حجرے میں ان کا بستر بچھا دیا، دوسرے دن وہ اوڑھنے کے لیے ایک کمبل لے آئے، تب سے اسی حجرے میں رہتے ہیں۔'' پھر مجھ سے پوچھا:

''تم انھیں کیسے جانتے ہو؟''

''ہماری طرف کے ہیں''۔ میں نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

''میں تمھیں ان کا بھائی سمجھ رہا تھا، صورت بہت ملتی ہے۔''

میں خاموش رہا، لیکن وہ بولتا رہا: ''بات چیت میں بہت اچھے ہیں، اسی شہر کے معلوم ہوتے ہیں۔ آواز بہت سریلی ہے۔ اُن کی اذان کانوں کو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ایک آدھ مرتبہ تو گھاٹ پر کے لوگ دیکھنے آئے کہ اذان کون دے رہا ہے۔''

میں سنتا رہا اور موذن بتاتا رہا: ''دن میں نکلتے ہیں لیکن ظہر سے پہلے آجاتے ہیں،

پھر عشاء پڑھ کر نکلتے ہیں اور دیر رات کو لوٹتے ہیں۔ کبھی کبھی دو۔دو، تین۔تین دن کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔'' وہ بتاتا رہا: ''پہلے میں پریشان ہو جاتا تھا، لیکن اب عادت ہو گئی ہے۔ جیسے ہی راستے کھلیں گے، سیدھے یہیں آئیں گے۔''

موذن بتاتا رہا، میں سنتا رہا لیکن اس کی باتیں سنتے وقت میں نے اپنی تکلیف اور بے چینی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لیکن ایک ڈر ضرور مجھے ستا رہا تھا: ایسے جھگڑے جب جب ہوئے ہیں، بھائی بے قابو ہو کر سڑک پر نکل آئے ہیں اور کئی بار زخمی بھی ہوئے ہیں۔ اس وقت مجھے یہی فکر لگی تھی کہ بھائی جوش میں سڑک پر نہ آ گئے ہوں اور کہیں....... آگے کی بات سوچ کر میرا دل لرز گیا۔ صحن میں بیٹھے ہوئے لوگ انتظار کر رہے تھے کہ راستے کھلنے کی اطلاع آئے تو اپنے اپنے گھروں کی طرف نکلیں۔ لیکن ایسی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ میں مسجد کی ایک محراب کے نیچے بیٹھا طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں دریا کنارے جا کر ٹھہرے ہوئے پانی پر صبح کے سورج کی شعاعوں کا عکس پڑتا ہوا دیکھوں اور پانی سے پھوٹنے والی روشنی کا نظارہ کروں۔ لیکن دریا میری دسترس سے باہر تھا۔ مجھے ایک لمبا چکر کاٹ کر دریا کی طرف جانا تھا، اتنی دیر میں طلوع ہوتی ہوئی صبح آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی اور وہ خوش نما منظر بھی غائب ہو جاتا جسے دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ نیمۂ شعبان کی رات جب ہم دریا کنارے عریضے ڈالنے آتے تو رات بھر دریا کی ریت پر جلتی ہوئی شمعوں کی قطاریں نظر آتیں اور سیاہ پوش بی بیاں نذر والے کونڈوں کے گرد بیٹھی دعائیں مانگ رہی ہوتیں اور رات کے آخری پہر سب اس بجرے کے آنے کا انتظار کرتے جو کہیں دور سے چل کر یہاں آتا اور بیچ دریا میں ٹھہر جاتا، پھر کشتیوں میں سوار ہو کر ہم اس بجرے پر جاتے اور نذر کا حلوہ کھاتے۔

دھوپ نکلنا شروع ہوئی تو صحن میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کچھ باہر سڑک پر آتے جاتے لوگوں سے یہ معلوم کرنے گئے کہ راستے کب کھلیں گے۔ لیکن ان میں سے کوئی راستے کھلنے کی خبر نہیں لایا۔ دوپہر ہوتے ہوتے کہیں سے خبر آئی کہ شام سے پہلے کچھ دیر کے لیے راستے کھلیں گے۔ اس خبر سے میں خوش بھی تھا اور افسردہ بھی۔ خوش اس لیے کہ میں دو دن سے اپنے ٹھکانے پر نہیں جا سکا تھا، اب جا سکوں گا۔ اور افسردہ اس لیے کہ اگر میں اپنے ٹھکانے پر

پہنچ گیا تو بھائی کی خبر کیسے ملے گی۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ گھر جاؤں یا یہیں مسجد میں ٹھہر کر بھائی کا انتظار کروں۔ سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا کہ میں گھر جاؤں اور خورد و نوش کا سامان جمع کر لوں کیونکہ اگر حالات زیادہ بگڑے تو کئی دن تک گھر میں رہنا پڑ سکتا ہے۔ بھائی کے بارے میں، اگر حالات میں سدھار ہوا تو دفتر جاتے وقت مسجد آ کر معلوم کر لوں گا۔

سہ پہر کے وقت جیسے ہی راستے کھلنے کی خبر آئی، میں گھر کے لیے نکل پڑا۔ مسجد چھوڑنے سے پہلے میں نے موذن سے کہا: ''بابا اگر آ جائیں تو دوبارہ اُس طرف مت جانے دیجیے گا۔''

''پہلے آئیں تو۔'' موذن بولا۔ ''تم سے زیادہ مجھے فکر ہے۔''

●

مسجد سے گھر کی طرف جاتے وقت میں نے ان دکانوں سے جو تھوڑی دیر کے لیے کھلی تھیں، بہت سا سامان خرید لیا۔ یہ سامان لیے میں گھر پہنچا تو دروازے پر مالک مکان بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

''کہاں رہے؟'' مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

''دریا والی مسجد میں۔'' میں نے کہا۔ ''دفتر سے لوٹتے وقت شاہ مینا والی سڑک سے پہلے ہی روک لیا گیا تھا۔ بتایا گیا کہ آگے نہیں جا سکتا راستے بند ہیں، بہت زور کا جھگڑا ہو گیا ہے۔'' یہ کہنے کے بعد کہا: ''بہت نقصان ہوا ہے۔ راستے بھر جلی ہوئی دکانیں دیکھتا آیا ہوں۔''

''لوگ بھی مارے گئے ہیں، کتنے یہ نہیں معلوم۔'' مالک مکان بولا: ''کل اخبار سے معلوم ہوگا۔'' پھر میرے سامان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''ضرورت کی چیزیں لے لیں۔''؟

''ہاں۔''

''ٹھیک کیا، جھگڑا بڑھ بھی سکتا ہے۔''

یہ سن کر بھائی کے خیال نے مجھے پھر ستانا شروع کر دیا۔

''پتہ نہیں کہاں ہیں، مسجد پہنچے یا نہیں۔'' میں نے سوچا۔

منجھلے کے محلے سے خبر آ گئی تھی کہ اُدھر کچھ نہیں ہوا ہے۔

رات مجھے نیند نہیں آئی، مجھے کیا کسی کو نہیں آئی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر کی چھتوں

پر جمع تھے۔ رات بھر گلی میں سیٹیاں بجتی رہیں۔ صبح جب چھتوں پر سے لوگ نیچے اترے اور گلی میں سیٹیاں بجنا بند ہوئیں تو میری آنکھ لگ گئی۔ دن چڑھے جب میں گہری نیند سے جاگا تو مالک مکان نے بتایا کہ راستے دن بھر کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں نہا دھو کر تیار ہوا اور گھر سے نکل پڑا۔ آدھے سے زیادہ دن گزر چکا تھا، اس لیے میں نے دفتر جانے کا خیال چھوڑ دیا اور سیدھا مسجد پہنچا۔ مسجد کے صحن میں کوئی نہیں تھا، موذن بھی نہیں۔ میں اس کے حجرے میں پہنچا تو وہ آرام کر رہا تھا۔ میں صحن میں بیٹھ کر اس کے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ ظہر کے وقت موذن اذان دینے کے لیے نکلا تو میں نے اس سے پوچھا:

''بابا آئے..؟''

''نہیں، آج تو راستے صبح سے کھلے ہوئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ پھر بولا: ''آئیں گے۔ اگر راستے بند نہیں ہوئے تو شام سے پہلے ضرور آئیں گے۔''

''کہاں رہ گئے؟'' میں بڑبڑایا۔

''جہاں رکے ہوں گے، ہوسکتا ہے ان لوگوں نے روک لیا ہو۔'' موذن نے کہا: پھر کہا: ''راستے کھلنے کے بعد چٹ پٹ وارداتیں ہو جاتی ہیں۔''

میرا دل زور سے دھڑکا۔ موذن میری پریشانی بھانپتے ہوئے بولا:

''لیکن تم ان کے لیے اتنا پریشان کیوں ہو؟''

''بابا میرے بھائی ہیں، بڑے بھائی۔'' میں نے کہا۔

''لیکن انھوں نے کبھی بتایا نہیں۔'' وہ بولا۔ ''جب بھی پوچھا کوئی آپ کا ہے، مسکرا کر خاموش ہو گئے۔''

''ہیں، سب ان کے ہیں، لیکن وہ کسی کو اپنا سمجھتے نہیں۔''

اس کے بعد موذن نے مجھ سے کچھ کہا نہ کچھ پوچھا۔

میں شام تک مسجد کے صحن میں بیٹھا بھائی کا انتظار کرتا رہا، لیکن بھائی نہیں آئے۔ بار بار میری نگاہیں صحن سے باہر سڑک کی طرف جاتیں اور ہر گزرنے والے پر بھائی کا گمان ہوتا۔ شام ہونے کے بعد بھی جب بھائی نہیں آئے تو میں نے موذن سے کہا:

''اب میں چلتا ہوں۔ بتا دیجئے گا کہ ان کے لیے بہت پریشان ہوں، کل پھر آؤں گا۔''

بھائی کے نہ آنے سے موذن بھی بہت پریشان تھا بلکہ مجھ سے زیادہ پریشان تھا۔

''آجانا چاہیئے اب تک۔'' وہ بولا۔ پھر بولا: ''ان کے ساتھ رہنے کی عادت ہوگئی ہے۔ صبح اٹھتے ہی مجھے چائے بنا کر دیتے ہیں، اُن کے ہاتھ کی چائے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔'' پھر کہا: ''رات اُدھر سے لوٹتے ہیں تو میرے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتے ہیں، پرانے قصے بہت یاد ہیں، دیر رات تک سناتے رہتے ہیں۔ پھر کچھ ٹھہر کر بولا: ''آجانا چاہیئے اب تک۔''

''آپ نے ٹھیک کہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''جہاں رکے ہوں گے ان لوگوں نے روک لیا ہوگا۔ حالات پوری طرح ٹھیک ہو جانے کے بعد شاید نکلنے دیں۔'' میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔

یہ بات سن کر موٴذن بھی مطمئن ہو گیا۔

راستے کھلے ہوئے تھے۔ میں مسجد سے نکل کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ نکلتے نکلتے میں نے ایک بار پھر موذن سے کہا: ''بتا ضرور دیجئے گا، میں آیا تھا، بہت پریشان ہوں ان کے لیے۔''

''بتا دوں گا، ضرور بتا دوں گا۔ سب کچھ ٹھیک رہا تو تمہاری طرف بھیج بھی دوں گا۔''

موذن بولا۔

●

میں مسجد سے نکلا تو کوئی سواری نظر نہیں آئی۔ جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے پرانے شہر کی طرف آنے والے راستوں پر سناٹا رہنے لگا تھا اس لیے میں گھر کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔

گھر پہنچا تو مکان مالک دروازے ہی پر مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا: ''کوئی آیا تھا۔'' پھر ذرا رک کر بولا:

''تمہارے بھائی کی خبر لایا تھا۔''

''کہاں ہیں؟''

''تھانے میں۔''

''تھانے میں؟''

''ہاں۔ گھر سے باہر نکلنا منع تھا، لیکن وہ نکل آئے۔ روکا گیا تو روکنے والوں سے

الجھ پڑے۔ انہوں نے تھانے لے جا کر بند کر دیا۔''

میں الٹے پاؤں تھانے کی طرف چل دیا، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ بھائی سلاخوں کے پیچھے بند ہیں۔ ساتھ میں کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی چیختے ہوئے بولے:

''لے چلو مجھے یہاں سے، یہ لوگ زبردستی لے آئے ہیں۔''

ان کی آواز سن کر تھانیدار اپنے کمرے سے نکل آیا۔

''یہ تمہارے کون ہیں؟'' اس نے بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔

''بھائی۔'' میں نے کہا۔

''چھڑانے آئے ہو؟''

''ہاں۔''

''کل کورٹ سے ضمانت ہو گی۔ یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''ان کا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہم نے ٹھیک کر دیا۔'' تھانیدار بولا۔ اور تب مجھے معلوم ہوا کہ بھائی کی آواز میں لرزش کیوں تھی۔

''ان کا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے تھانیدار سے پھر کہا۔ ''کسی سے بھی پوچھ لیجئے۔''

''ہم کچھ نہیں جانتے۔ قانون توڑا ہے تو مقدمہ تو بنتا ہے۔''

''کچھ کیجیے۔'' میں نے کہا۔

''کیا کرتے ہو؟'' تھانیدار نے مجھ سے پوچھا۔

''نوکری، دفتر میں۔''

''ہوں... ذاتی مچلکے پر چھوڑ سکتا ہوں۔ پانچ ہزار دینا ہوں گے۔''

''پانچ ہزار؟ یہ تو بہت ہیں۔''

''پورے پانچ ہزار، ہم مچلکے پر چھوڑ دیں گے، مقدمہ نہیں بنائیں گے۔''

''لیکن عدالت تو مان لے گی یہ پاگل ہیں۔'' میں نے کہا

''تو پھر جاؤ عدالت۔ ضمانت تو ہو جائے گی لیکن مقدمہ قائم ہوگا۔'' وہ بولا۔ پھر بولا:
''ثابت کرتے رہو کہ یہ پاگل ہیں۔ نہیں ثابت ہوا تو سزا ہوگی۔''

میں نے سوچا کہ عدالت میں بھائی کو پاگل ثابت کرنا واقعی آسان نہیں ہے۔ عام گفتگو میں وہ ہوش مندوں سے زیادہ ہوش کی باتیں کرتے ہیں۔ اس وقت کسی کو یقین نہیں آسکتا کہ ان کے دماغ میں خلل ہے۔

''انتظام کرنا پڑے گا۔ اتنے روپے نہیں ہیں اس وقت میرے پاس۔'' میں نے کہا۔

''تو جاؤ انتظام کرو۔ دیر کرو گے تو مقدمہ قائم ہو جائے گا۔''

تھانے سے نکل کر میں نے اِدھر اُدھر سے کسی طرح پانچ ہزار کا انتظام کیا اور بھائی کو ذاتی مچلکے پر چھڑا لایا۔ جب میں انھیں سلاخوں سے باہر لایا تو ان کا پورا جسم دکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی داہنی آنکھ سوجی ہوئی تھی اور اس کے گرد سیاہ حلقہ بن گیا تھا۔ بائیں طرف کا گال پھولا ہوا تھا اور سر میں دو۔ تین جگہ گومڑے پڑ گئے تھے۔ پوری پیٹھ پر برتوں کے نشان تھے۔ وہ لنگڑا لنگڑا کے چل رہے تھے۔ میں انھیں پکڑ کر کسی طرح سواری تک لایا۔ سواری پر بیٹھتے ہی انھوں نے کہا: ''بہت مارا ہے حرامزادوں نے۔''

''کیوں الجھ گئے ان سے۔ آپ بھی تو.......''

مجھے ان کی یہ حالت دیکھ کر غصہ بھی آ رہا تھا اور تکلیف بھی ہو رہی تھی لیکن میں نے بھائی سے کچھ نہیں کہا۔

گھر پہنچ کر میں نے سب سے پہلے کپڑا گرم کر کے بھائی کی چوٹوں کی سنکائی کی، جہاں جہاں زخم آئے تھے، انھیں گرم پانی سے دھویا اور ان پر مرہم لگایا پھر گرم دودھ میں پھٹکری ڈال کر بھائی کو پلایا۔ ان سب چیزوں سے انھیں بہت آرام ملا۔ وہ دو راتوں کے جاگے ہوئے تھے۔ آرام ملتے ہی گہری نیند سو گئے۔ صبح میں نے انھیں چائے بنا کر دی تو انھوں نے مجھ سے پوچھا:

''دفتر جاؤ گے؟''

''نہیں، آج اتوار ہے۔''

''یہ سن کر ان کا چہرہ چمک اٹھا۔'' بولے: ''اچھا ہے۔ کہیں نکلنا نہیں۔ میرے ہی پاس رہنا۔'' چائے پینے کے بعد انھوں نے کہا: ''چھوٹے مکان جا کر فرزانہ کو لے آؤ۔ آج روغنی روٹی اور خاگینہ کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔'' فرزانہ ہمارے چھوٹے ماموں کی سب سے چھوٹی لڑکی تھی جو ہمارے آبائی مکان سے ملے ہوئے مکان میں رہتی تھی اور کھانا بہت عمدہ پکاتی تھی۔

''وہاں سے کسی نے تھانے جا کر آپ کی خبر لی۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کوئی نہیں آیا۔'' پھر بولے: ''ڈر کے مارے نہ آئے ہوں گے۔''

''پتہ تو چل گیا ہوگا، آپ تھانے میں ہیں۔''

''ضرور چل گیا ہوگا جب مجھے لے جایا جا رہا تھا تو چھتوں پر سے کئی لوگوں نے دیکھا تھا۔''

''سب بڑے مطلبی ہیں۔''

''نہیں مطلبی نہیں ہیں، جو لوگ اپنے عزیزوں کو چھڑانے آتے تھے انھیں بھی بٹھا لیتے تھے۔'' انھوں نے کہا۔ پھر کہا: ''ایسے میں کون خطرہ مول لیتا۔''

میں چھوٹے مکان پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی سب ایک ساتھ بولے:

''لے آئے اپنے بھائی کو۔''

''لے آیا، مگر آپ لوگ کیا کر رہے تھے؟''

''لالو اور ریاست کو چھڑانے ان کے گھر والے گئے تھے، انھیں بھی پکڑ لیا، اس لیے ہم نہیں گئے...'' انھوں نے پڑوس سے پکڑے جانے والے دو آدمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں تو لے آیا۔'' یہ سن کر وہ سب خاموش ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ تھانے کیوں نہیں گئے۔، جاتے تو لیے دیے بغیر بات نہ بنتی۔

چھوٹے مکان میں کچھ دیر بیٹھ کر میں اپنی بہن فرزانہ کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے بھائی کو دیکھنے اس گھر کے اور لوگ بھی چلے آئے۔ فرزانہ نے آتے ہی بھائی کے لیے روغنی روٹی اور خاگینے کا ناشتہ تیار کیا۔ بھائی نے بڑے شوق سے ناشتہ کیا۔ دوسرے لوگ بھائی کو گھیرے بیٹھے تھے۔

''بہت ظالم ہوتے ہیں کمبخت۔'' بھائی کی چوٹوں کو دیکھ کران میں سے ایک بولا۔

''ہاں، بتاؤ کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔'' دوسرا افسوس کے ساتھ بولا۔ ''کتنی بری طرح مارا ہے۔''

''معلوم تھا کہ باہر نکلنا منع ہے، پھر کیوں نکل گئے۔'' تیسرا ناراض ہوتے ہوئے بولا۔

''کیا حال بنا دیا ہے مردودوں نے۔'' ممانی بولیں۔ پھر بولیں: ''سنکائی کرتے رہو۔''

پھرانھوں نے ایک اینٹ منگوائی اور مجھ سے کہا: ''تولیہ لاؤ اپنا۔''

میں تولیہ لایا تو کہا: ''پہلے اینٹ کو خوب گرم کرنا۔'' پھر اینٹ کو تولیے کی دو پرتوں میں لپیٹتے ہوئے کہا: ''گرم ہو جانے کے بعد اس طرح رکھ کر دن میں تین۔ چار مرتبہ سنکائی کرنا، درد اور سوجن دونوں کم ہو جائیں گے۔''

بھائی کی عیادت کرنے اور ان کے علاج کے طریقے بتانے کے بعد چھوٹے مکان والے چلے گئے، لیکن فرزانہ بھائی کے پاس بیٹھی ان کا سر دباتی رہی۔ سر دباتے اس نے بھائی سے پوچھا:

''دن میں کیا کھائیں گے؟''

''مونگ گوشت، زمانہ ہوا کھائے ہوئے۔''

''یہ سب گھر کے کھانے ہیں، گھر میں رہیے تو ملیں۔''

فرزانہ بھائی کا سر دبا رہی تھی اور وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھ رہے تھے۔ پوچھتے پوچھتے بولے:

''ابّو کی برسی کب ہے۔'' ماموں کو ہم لوگ ابّو کہتے تھے۔

''اگلے مہینے۔''

''ہاں مجھے خیال تھا کہ انھیں مہینوں میں ان کا انتقال ہوا ہے۔'' پھر پوچھا: ''ہمارے مکان کے کیا حال ہیں۔''

''ہم لوگوں کا آنا جانا زیادہ نہیں ہے۔'' فرزانہ بولی: ''اب تو تیسری منزل بھی بن گئی ہے۔''

بھائی چپ رہے۔ پھر فرزانہ کا ہاتھ روکتے ہوئے بولے:

''جانتی ہو۔ آپا، تمہاری ماں کا انتقال کیسے ہوا تھا؟''

''کیسے؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

''ہمارے گھر کی ڈیوڑھی میں رات انھوں نے بڑی تکلیف میں گزاری تھی، ماں رات بھر اُن کے سرہانے بیٹھی رہی۔'' انھوں نے بتایا۔ پھر کہا: ''صبح انھیں خون کی بہت بڑی قے ہوئی، پھر انھوں نے ماں کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ تم ایک سال کی بھی نہیں ہوئیں تھیں اس وقت۔'' بھائی ہمارے مکان سے متعلق بہت سی باتیں بتاتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے کہا:

''پتہ نہیں ہمارے کرائے داروں کا کیا حال ہے؟''

''کون سے کرائے دار؟''

''اوپر والے ببّن چچا جو موزوں کی بُنائی کا کام کرتے تھے۔''

''مر گئے کب کے۔''

''اور ان کے بیٹے زین، جنھیں لوگ میاں کہہ کر پکارتے تھے۔''

''اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔''

''دو لڑکیاں بھی تھیں اُن کی؟''

''ایک پاگل ہو گئیں، ایک کا انتقال بہت پہلے ہو گیا۔'' فرزانہ نے کہا۔ ''پاگل والی کچھ دنوں پہلے تک سڑکوں پر نظر آتی تھیں۔ اب نہیں دکھائی دیتیں۔''

''اور نیچے والے کرایہ دار؟''

''خالہ کا کئی برس پہلے انتقال ہو گیا۔ ان کے بیٹے اختر جو کبوتر پالتے تھے.....''

ان کے بارے میں تو معلوم ہے۔ بھائی فرزانہ کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔ ''دیانت الدولہ کی کربلا میں رہتے ہیں۔ دعا تعویذ کرنے لگے ہیں''۔ پھر بولے: ''کچھ دن پہلے کاظمین کی طرف گیا تھا۔ کربلا کے متولی نے بتایا، وہاں کے کچھ حصے پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔'' پھر کچھ اور یاد کرتے ہوئے کہا: ''اختر کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے، ناصر، منجھلے کے دوست.........''

''وہ بھی نہیں رہے۔ کئی سال پہلے اُن کے سینے میں درد اُٹھا تھا، ہسپتال جاتے جاتے چل بسے۔''

''اچھا اب یہ باتیں چھوڑیے اور سو جایئے۔'' فرزانہ ان کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولی۔ شام کو قیمہ مٹر اور پراٹھے، ٹھیک ہے۔''

''دل کی بات کہہ دی۔'' بھائی بولے۔ ''تم نہ کہتیں تو میں کہتا۔''

''مجھے معلوم ہے قیمہ مٹر آپ کو بہت پسند ہے۔''

''ہاں لیکن ماں بھی ہو تو اچھا ہے۔'' بھائی نے کہا۔ ''دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ یہاں نہیں رہتی؟'' انھوں نے فرزانہ سے پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے فرزانہ نے میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ بھائی بہکنے لگے ہیں۔

''اب لیٹ جایئے۔ سنکائی ہونا ہے۔'' فرزانہ نے تخت پر سے برتن ہٹا کر بھائی کو لٹاتے ہوئے کہا۔ پھر اینٹ گرم کر کے دیر تک بھائی کی چوٹوں کی سنکائی کرتی رہی۔

●

بھائی اس بار کئی دن میرے ساتھ رہے۔ فرزانہ انھیں طرح طرح کے کھانے پکا کر کھلاتی رہی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اب وہ میرے ساتھ ہی رہیں گے ایک صبح ان سے پوچھا:

''مسجد میں آپ کا کتنا سامان ہے؟''

''کیوں؟''

''لے آؤں۔''

''نہیں میں خود لے آؤں گا۔'' یہ سن کر میں ٹھٹکا۔

''پھر وہیں جانے کا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ لیکن سامان میں ہی لاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی۔''

دفتر کے لیے نکلتے وقت میں نے ان سے کہا: ''دن کا کھانا چھوٹے مکان سے

آجائے گا، اپنی پسند کی کوئی چیز کھانا ہو تو بتا دیجیے۔"

"جو آجائے گا کھالوں گا۔" انھوں نے کہا۔

شام کو میں دفتر سے لوٹا تو کمرے میں تالا پڑا تھا۔ مالک مکان نے بتایا کہ تمہارے بھائی کمرہ بند کر کے چابی مجھے دے کر چلے گئے۔

"کہاں گئے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ نہیں بتایا۔" پھر جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ دیا ہے تمہارے لیے۔"

میں نے لفافہ کھولا، اس میں رکھا ہوا پرچہ نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا:

"اس بار تم نے میری بہت خدمت کی۔ اوپر والا تمھیں اس کا اجر دے گا۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ماں کو دیکھے ہوئے بہت دن ہوگئے۔ اسی کی تلاش میں نکلا ہوں۔ میں نے جو گھر موسیٰ باغ میں بنوایا ہے شاید وہاں گئی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ منجھلے کے یہاں چلی گئی ہو۔ تمہارے یہاں رہنے کا ایک فائدہ ہوا۔ میں نے ایک حویلی، بہت بڑی حویلی کا نقشہ تیار کیا ہے۔ شیش محل کے آگے جہاں سے گل لالہ شروع ہوتا ہے ایک ویران مقام ہے جہاں بہت بڑی زمین خالی پڑی ہے۔ اسے خریدنے کا ارادہ ہے، اسی پر حویلی بنے گی۔ حویلی کی صورت اس طرح ہوگی: اچھی طرح ترشے ہوئے برابر کے چوکور پتھروں سے چہار دیواری کی تعمیر ہوگی جس کے چاروں کونوں پر پہل دار گنبد ہوں گے جن کے عکس پر طلائی چاند ہوں گے۔ اس کا صدر دروازہ اتنا بڑا ہوگا کہ ہاتھی مع ہودہ نکل جائے۔ حویلی کے پھاٹک پر ایک نوبت خانہ ہوگا جس میں شہنائی کے بجنے کا بھی انتظام ہوگا اور ایک سپاہی کو گھنٹہ بجانے پر مقرر کیا جائے گا۔ حویلی کے اندر دہرے دالان اور بڑے بڑے کمرے

ہوں گے جن کے پہلو میں خوبصورت صحنچیاں اور شہ نشینیں ہوں گی۔
دالانوں میں خوبصورت جھاڑ ہوں گے جن میں کئی کئی بتیاں ہوں گی
اور جو رنگ رنگ کے کنولوں اور ڈالوں کے ساتھ چھتوں سے لٹکے
ہوں گے۔ ایک بہت بڑا صحن ہوگا، صحن کے بیچ میں چمن ہوگا اور چمن
کے بیچ میں فوارہ۔ ماں کے لیے اندر کے دالان میں ایک بہت بڑا
چوکا ہوگا جس پر خوبصورت قالین بچھے ہوں گے۔ ماں کی خدمت
کے لیے مغلانیاں اور پیش خدمتیں ہوں گی۔ ایک بہت بڑا باورچی
خانہ ہوگا جس میں ہر وقت پکوان پکتے رہیں گے۔ صحن کے بعد کے
بڑے حصے میں ماں کے لیے ایک بڑا سا امام باڑہ ہوگا جیسا حکیم
صاحب عالم کے مکان میں تھا۔ ماں وہاں شوق سے عزاداری
کرے گی۔

دعا کرو کہ مجھے اچھے اور ماہر کاریگر مل جائیں۔''

تمہارا

بڑا بھائی

میں جتنی دیر خط پڑھتا رہا، مالک مکان میرے سامنے کھڑا رہا۔ خط پڑھ چکا تو اس نے پوچھا:

''کیا لکھا ہے؟''

''بھائی پھر سنک گئے ہیں۔ حویلی بنوا رہے ہیں بہت بڑی۔''

مالک مکان مسکرایا پھر اسے کچھ یاد آیا کہنے لگا: ''کل مولا کی مسجد والی گلی سے غفرآنماب کے امام باڑے جا رہا تھا۔ وہاں داہنی طرف جو حویلی ہے اسے توڑا جا رہا تھا۔''

''وہی جہاں کبھی ایک چھاپہ خانہ بھی ہوا کرتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اسی کے آگے شہزادی کی ڈیوڑھی تھی۔''

''بک چکی کب کی۔ فقیر محمد تمبا کو والے نے خریدی ہے۔'' مالک مکان نے کہا۔

''اب اس کے اندر تمبا کو کا کارخانہ ہے۔''

مکان مالک اور میں بڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

میں بھائی کا خط لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بستر پر دراز ہو کر میں نے طے کیا کہ بھائی اگر آ گئے تو ٹھیک ہے، نہیں آئے تو ڈھونڈنے نہیں جاؤں گا۔

●

بھائی کو میرے یہاں سے گئے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے لیکن وہ لوٹ کر نہیں آئے۔

اس بیچ میں نے اپنا مکان بدل لیا اور اسی علاقے میں ایک اور مکان میں رہنے لگا۔ یہاں میرے پاس اتنی جگہ تھی کہ بھائی الگ کمرے میں آرام سے رہ سکتے تھے۔ مکان بہت اچھا تھا، کمرے ہوادار تھے اور صحن بھی کشادہ تھا۔

''بھائی کو یہ جگہ پسند آئے گی۔'' میں نے سوچا۔ میرا جی چاہا کہ وہ لوٹ آئیں اور میرے ساتھ یہاں آرام سے رہیں۔ میں، جیسا کہ میں نے طے کیا تھا، انھیں ڈھونڈنے نہیں نکلا۔ ایک دن اسی محلے میں میری ملاقات پہلے والے مالک مکان سے ہوگئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا:

''نیا مکان کیسا ہے؟''

''اچھا ہے۔ آرام آپ کے یہاں بھی تھا، لیکن یہ نیچے کی جگہ ہے۔''

''اور تمہارے بھائی۔ بن گئی ان کی حویلی۔'' اس نے مزاحاً کہا۔

''جس دن سے آپ کو چابی دے کر گئے ہیں، واپس نہیں آئے۔''

''پتہ نہیں لگایا، کہاں ہیں۔''

''کہاں تک ڈھونڈوں۔'' میں نے کہا۔ ''دور دور سے ڈھونڈ کر لاتا ہوں، اپنے ساتھ رکھتا ہوں لیکن.....''

''بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔'' مالک مکان بولا۔ مجھے اس کا یہ جملہ اچھا نہیں لگا لیکن سننا پڑا۔

’’ہاں، رکتے نہیں میرے ساتھ۔‘‘

’’مجھے تو سڑی سودائی لگتے ہیں۔‘‘ مالک مکان بولا۔ اس بار مجھے پھر اس کا جملہ اچھا نہیں لگا۔

’’جی نہیں۔ کبھی بیٹھ کر باتیں کیجیے، دیکھیے کیسی عمدہ گفتگو کرتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ پھر کہا: ’’مزاج میں سیمابیت ہے۔ دل کسی ایک جگہ نہیں لگتا۔ ماں ٹھیک کہتی تھی۔‘‘ میں کہتے کہتے رک گیا۔

’’کیا کہتی تھی۔‘‘ مالک مکان نے پوچھا۔

’’اُس وقت اُس کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔‘‘

’’کیا کہتی تھی؟‘‘ مالک مکان نے پھر پوچھا۔

’’کہتی تھی، اس کی آشفتہ سری کو لوگ پاگل پن سمجھتے ہیں۔‘‘

مالک مکان جس کا تعلق پرانے شہر کے ایک شائستہ گھرانے سے تھا بولا:

’’ٹھیک کہتی تھی۔ پاگل کا دماغ تو ہمیشہ بگڑا رہتا ہے۔‘‘ پھر بولا: ’’تمہارے بھائی ایسے نہیں لگتے۔ بہک تو ہم لوگ بھی جاتے ہیں کبھی کبھی۔‘‘ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا: ’’لیکن کچھ نہ کچھ تو خلل ہے۔‘‘

مالک مکان یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ پھر کچھ دور جا کر مڑا اور کہا: ’’کہیں نظر آئے تو بتاؤں گا۔‘‘

میں بھائی کو ڈھونڈنے نہیں نکلا لیکن دن رات دل انھیں میں لگا رہتا تھا۔ کئی دنوں سے میں منجھلے کی طرف بھی نہیں گیا تھا۔ آج سویرے سویرے یہ سوچ کر ان کی طرف چل پڑا کہ شاید انھیں کہیں سے بھائی کی خبر ملی ہو۔ منجھلے کو شہر میں ہر طرف لوگ جانتے تھے اور ان میں سے اکثر یہ بھی جانتے تھے کہ بھائی ان کے بڑے بھائی ہیں۔ اگر منجھلے کو بھائی کی خبر ملی ہوگی تو کم سے کم مجھے بھائی کا حال احوال معلوم ہو جائے گا۔ منجھلے کی طرف جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ منجھلے سے بھائی کے بارے میں اور بھائی کے بہانے ماں کے بارے میں بات کر کے میری آزردگی کچھ کم ہوگی۔

میں منجھلے کے گھر پہنچا تو وہ کارخانے کے لیے نکل رہے تھے۔ بھائی ہی کی طرح منجھلے نے بھی بیچ ہی سے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور بہت چھٹپنے میں لوہے کی جڑائی کا کام سیکھ لیا تھا۔ اس میں انھیں اچھے خاصے پیسے ملنے لگے تھے۔ پھر انھوں نے لوہے کی جالیوں اور پھاٹکوں کے بنانے کا ٹھیکہ لینا شروع کر دیا، اس میں انھیں اور اچھے پیسے ملنے لگے اور تب انھوں نے ایک کارخانہ کھول لیا اور کھاتی پیتی زندگی گزارنے لگے۔

سویرے سویرے مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر انھوں نے حیرت سے پوچھا:

''خیریت تو... اتنی صبح....؟''

''کچھ نہیں۔ چھٹی کا دن ہے۔ سوچا آج یہیں گزاروں، آپ کے یہاں۔'' پھر پوچھا: ''آپ صبح صبح کہاں نکل رہے ہیں؟''

''کارخانے۔''

''آج چھوڑیے۔ کاریگر سنبھال لیں گے۔'' میں نے کہا۔ پھر کہا: ''میں دن بھر یہیں رہوں گا۔ دوپہر اور شام کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔''

منجھلے نے میری بات مان لی۔ پھر مجھ سے پوچھا:

''ناشتہ کر لیا؟''

''نہیں۔ وہ بھی یہیں کروں گا۔''

منجھلے کی بیوی نے جلدی جلدی میرے لیے آلو کے پراٹھے پکائے۔ جب میں ناشتہ کر چکا تو منجھلے نے پوچھا:

''بھائی ہیں تمھارے ساتھ۔''

''نہیں۔ کئی دن رہے۔ پھر ایک دن جب میں دفتر میں تھا مالک مکان کو چابی دے کر کہیں نکل گئے۔'' میں نے کہا، پھر منجھلے کو دریا والی مسجد سے لے کر تھانے تک کی پوری بات بتائی اور پوچھا:

''یہاں سب ٹھیک رہا؟''

''ہاں۔ درگاہ میں کچھ ہوا تھا۔ پتھر بازی۔ کچھ ہوائی فائر بھی ہوئے۔'' انھوں نے

کہا۔ پھر بتایا: ''پہلے دری والے نکلے۔ پھر درگاہ کے لوگ۔ خوب نعرے بازی ہوئی۔ کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے۔ لیکن پولیس وقت پر آ گئی۔ جھگڑا بڑھ نہیں سکا۔ لیکن اپنی طرف بہت زیادہ ہوا ہے۔'' ان کی مراد اپنے آبائی محلے سے تھی۔

''ہاں مالک مکان بتاتا تھا دونوں طرف بہت نقصان ہوا ہے۔ مالی بھی اور جانی بھی۔''

''بھائی کے بارے میں مجھے پتہ چل گیا تھا۔'' منجھلے نے کہا۔ ''لیکن یہاں سے نکلنا مشکل تھا۔ جب حالات ٹھیک ہوئے تو پتہ چلا تم انھیں لے آئے۔'' پھر بولے: ''انھیں دیکھنے کو جی بہت بے چین تھا مگر میں جان کر تمہارے گھر نہیں آیا۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے دیکھتے ہی وہ اُبل پڑتے ہیں۔''

''وہ سمجھتے ہیں آپ نے ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔'' میں نے کہا۔

''اُنھوں نے کیا؟''

''اُن کی بات دوسری ہے۔ وہ صحیح دماغ کے تھوڑی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن وہ ماں کو چاہتے بھی بہت تھے۔''

''میں نہیں چاہتا تھا؟''

''چاہتے تھے، لیکن آپ نے ماں کے لیے کچھ کیا نہیں۔''

''کیا کرتا؟''

''دکھ کے دنوں میں آپ گھر میں بیٹھے رہے، بھائی کے ساتھ آپ کو بھی کچھ کرنا چاہیے تھا۔''

''چھوڑو ان باتوں کو۔ ماں کا فاتحہ یاد ہے؟''

''اگلی جمعرات کو۔''

''ہاں۔'' انھوں نے کہا۔ ''بھائی کا پتہ چل جاتا تو تمہارے ساتھ جا کر انھیں بھی لے آتا۔''

''میں سمجھ رہا تھا آپ کو کہیں سے خبر ملی ہوگی۔''

''نہیں، کوئی خبر نہیں ملی۔''

''میں اب انھیں نہیں ڈھونڈوں گا۔''

''کیوں؟''

''وہ کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہر طرح کا آرام تھا میرے یہاں لیکن چلے گئے۔''

''تم نے گھر بدل لیا ہے؟'' منجھلے نے پوچھا۔

''وہی بتانے والا تھا۔ بڑی جگہ ہے۔ بھائی الگ کمرے میں بڑے آرام سے رہ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن رہیں گے نہیں۔''

''جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ وہ میرے ساتھ رہیں۔'' پھر اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:

''جب سے ان کے ابا کا انتقال ہوا ہے، میں یہیں رہ رہا ہوں۔ گھر بڑا ہے۔ بھائی رہتے تو ڈُھارس رہتی۔''

میں خاموش رہا۔ منجھلے کی بیوی نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ بھی یہی چاہتی ہوں۔

منجھلے کے یہاں میں دن بھر رہا اور دن بھر بھائی اور ماں کی باتیں ہوتی رہیں۔ منجھلے کی بیوی نے مجھے دونوں وقت بہت عمدہ کھانا کھلایا۔ رات کے کھانے کے بعد جب میں منجھلے کے گھر سے نکل رہا تھا تو میری آزردگی ختم ہو چکی تھی۔ گھر آ کر میں سونے کے لیے لیٹ گیا لیکن سونے سے پہلے مجھے اس خواب سے خوف آنے لگا جس میں مجھے وہ دنیائیں دکھائی دینے لگتی تھیں جنھیں دیکھنے کے بعد صبح بیدار ہو کر میں بہت دیر تک ملول رہتا تھا۔ مجھے اس خواب کا خوف آتا رہا لیکن یہ خوف نیند کو آنے سے نہیں روک سکا۔ صبح میں جاگا تو مجھے یہ تو یاد رہا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا تھا لیکن یہ یاد نہیں رہا کہ خواب میں کیا دیکھا تھا۔

ماں کے فاتحے میں تین دن رہ گئے تھے لیکن بھائی کا کہیں کوئی پتہ نہیں تھا۔ پتہ چل جاتا تو میں کسی سے ان تک فاتحے کی خبر بھجوا دیتا۔ میں نے خود کو اطمینان دلایا کہ ابھی تین دن ہیں اور ان تین دنوں میں کسی نہ کسی سے کہیں نہ کہیں بھائی کے ہونے کی خبر مل سکتی ہے۔

ماں کے فاتحے سے ایک دن پہلے میرے محلے میں ایک موت ہوگئی۔ مرنے والا اس جھگڑے میں جو ابھی کچھ دن پہلے ہوا تھا، بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ اس کے جنازے میں محلے کا ہر شخص شریک تھا۔ جنازہ اٹھنے سے پہلے ان سڑکوں پر پہرہ بڑھا دیا گیا تھا جدھر سے جنازے کا جلوس گزرنے والا تھا۔ محلے کے دوسرے لوگوں کی طرح جنازے میں میں بھی شامل تھا۔ مرنے والے کی تدفین اسی قبرستان میں ہونا تھی جہاں ماں کو دفن کیا گیا تھا۔ جنازے کا جلوس قبرستان پہنچا تو شام ہوچکی تھی، تدفین ہوتے ہوتے رات ہوگئی۔ جنازے میں شامل لوگ راستے بھر جھگڑے کے بارے میں باتیں کرتے آئے تھے، یہی باتیں وہ قبرستان میں بھی کررہے تھے:

''ہماری طرف کے لوگ زیادہ مارے گئے۔'' کسی نے کسی سے کہا۔

''نہیں۔ اُدھر بھی اچھے خاصے مرے ہیں۔ حساب برابر کا ہے۔ ایک دو کا فرق ہوتو ہو۔''

''لیکن جمشید تو مفت میں مارا گیا۔'' کسی نے مرنے والے کا نام لیتے ہوئے کہا۔

''وہ تو کام پر سے لوٹ رہا تھا۔''

''یحییٰ گنج میں گھیر کر حملہ کیا۔'' کوئی اور بولا۔ ''اُس وقت تو بچ نکلا لیکن......''

''بہت گہرے وار تھے۔ بچنا مشکل تھا۔'' دوسرا بولا۔

'' چھنگی بسکٹ والے کا لڑکا بھی اسی طرح مارا گیا۔''

''کہاں؟''

'' تکیے پر۔ وہاں بھی لوگ گھات لگائے بیٹھے تھے۔''

''دو مہینے بعد جلوس اٹھنے والے ہیں۔ اس میں پھر ہوگا۔'' کسی اور نے کہا۔

''تیاری ابھی سے ہے۔''

پھر انھیں میں سے ایک نے میرے پاس آ کر کہا: ''تمہارے بھائی پکڑ لیے گئے تھے!!''

''ہاں''۔

''کسی نے بتایا کہ تم تھانے ہی سے چھڑا لائے؟''

''ہاں۔''

''اور کسی کو تو نہیں چھوڑا، سب کی ضمانت کورٹ سے ہوئی۔''

میں چپ رہا۔

''پاگل ہیں اس لیے چھوڑ دیا ہوگا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مرنے والے کی قبر تیار ہو چکی تھی۔ لوگ اب بھی وہی باتیں کر رہے تھے۔ جب مرنے والے کو مٹی دی جا رہی تھی تو سوگواروں میں سے کوئی چیخ کر بولا:

''چھوڑیں گے نہیں۔''

دوسروں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی تو اس نے اور اونچی آواز میں کہا:

''نہیں چھوڑیں گے۔ جمشید کا بدلہ ضرور لیں گے۔''

پھر لوگ اسے چپ کرا کر یہ کہتے ہوئے باہر لے گئے کہ یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔

رات ہو چکی تھی۔ سوگوار قبرستان سے لوٹ رہے تھے لیکن میں وہیں رکا رہا۔ جب سب چلے گئے تو میں نے گورکن سے لالٹین لے کر رات کے اندھیرے میں اس حصے کو تلاش کرنا شروع کیا جہاں ماں کو دفن کیا گیا تھا۔ ماں کی قبر جس کی حالت اب خراب ہونے لگی تھی بالآخر مجھے مل گئی۔ میں قبر کے پاس بڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ جب بہت دیر ہوگئی تو گورکن نے مجھ سے آ کر کہا: ''لالٹین کی ضرورت ہے، قبر کی مٹی برابر کرنا ہے۔''

میں نے لالٹین گورکن کے حوالے کی اور اس کی مدھم روشنی میں گورکن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ گورکن لالٹین لیے ہوئے اس تازہ قبر پر پہنچ چکا تھا جس کی مٹی اسے برابر کرنا تھی۔ یہاں سے قبرستان کا دروازہ اب بھی بہت دور تھا۔ اندھیرا بہت گہرا تھا لیکن میں نے گورکن سے یہ نہیں کہا کہ وہ مجھے لالٹین کی روشنی میں قبرستان کے دروازے تک چھوڑ دے۔ میں اندھیرے ہی میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب مجھے محسوس ہوا کوئی میرے آگے آگے چل رہا ہے۔ پہلے تو وہ ایک ھیولیٰ سا لگا، پھر اس ہیولے نے ماں کی شکل اختیار کر لی۔ پھر وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور پھر اس نے بولنا شروع کر دیا:

''اب کی بہت دن بعد آئے۔''

''آنا چاہا کئی بار، لیکن کچھ الجھنیں تھیں۔''

''بڑا مہینے میں دو۔تین بار آتا ہے، یاد رکھتا ہے مجھے۔''

''میں بھی یاد رکھتا ہوں۔''

''یاد رکھتے تو اسی کی طرح تم بھی آتے، منجھلا تو آتا ہی نہیں۔''

''لیکن ہر تیسرے مہینے آپ کا فاتحہ کراتے ہیں۔''

''کل پھر ہے میرا فاتحہ۔کل جمعرات ہے نا۔''

''ہاں۔''

''بڑے کو بلایا ہے؟''

''بہت دن سے ان کی کوئی خبر نہیں۔''

''میں نے کہا تھا اس کا خیال رکھنا۔''

''رکھتا ہوں، جب میرے پاس رہتے ہیں تو بہت خیال رکھتا ہوں۔''

''کیوں جانے دیتے ہو اسے، اپنے پاس سے۔''

''میں نہیں جانے دیتا، وہ خود چلے جاتے ہیں۔''

''ابھی تک آپ نکلے نہیں۔'' ایک اور آواز سن کر میں چونکا۔ گورکن لالٹین لیے میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''راستہ بھٹک گئے۔'' اس نے کہا

''نہیں۔میں تو پھاٹک کی طرف جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ اُس طرف جا رہے ہیں، جدھر پہلے گئے تھے۔''

''پھاٹک کدھر ہے؟''

''اُس طرف۔'' گورکن نے پھاٹک کی طرف اشارہ کیا۔ ''مڑیے اور سیدھے چلے جائیے۔''

گورکن کے بتانے پر مجھے معلوم ہوا کہ میں پھاٹک کی طرف ہی جا رہا تھا، لیکن پاؤں

ماں کی قبر کی طرف مڑ گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ کچھ دیر پہلے جو کچھ میں نے دیکھا تھا اور جو کچھ سنا تھا اور جو کچھ بولا تھا وہ خواب تھا یا واقعی وہ سب کچھ ہوا تھا۔ کیا واقعی ماں نے مجھ سے اور میں نے ماں سے بات کی تھی۔ کیا اسی طرح بھائی کو بھی ماں نظر آتی رہتی ہے۔ ضرور آتی رہتی ہے تبھی تو انھیں ماں کے مرنے کا یقین نہیں آتا۔ یہی سب سوچتا ہوا میں قبرستان سے باہر نکل آیا اور گھر آکر سو گیا۔

●

ماں کے فاتحے کے دن میں منجھلے کے گھر پہلے سے پہنچ گیا۔ فاتحہ کا سامان جب چوکی پر رکھا جانے لگا تو منجھلے نے مجھ سے پوچھا: ''بھائی کی کوئی خبر ملی؟''

''نہیں۔''

منجھلے کی بیوی سارا سامان چوکی پر لگا چکی تھیں۔ فاتحہ شروع ہونے والا تھا کہ اچانک بھائی گھر میں داخل ہوئے اور فاتحہ کے لیے جمع لوگوں میں چپ چاپ شامل ہو گئے۔ فاتحہ ختم ہوا تو بھائی کسی سے کچھ بولے بغیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے اور بہت دیر تک چپکے بیٹھے رہے۔ سب انھیں دیکھ رہے تھے لیکن کوئی ان سے بول نہیں رہا تھا۔ وہ بہت دبلے ہو گئے تھے۔ چہرے کی رونق غائب ہو گئی تھی۔ سر کے بال اور ہاتھوں اور پیروں کے ناخن بہت بڑھے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی بڑھتے بڑھتے سینے تک آ گئی تھی اور کپڑے بھی شاید بہت دنوں کے پہنے ہوئے تھے۔ بہت دیر بعد آنے والوں میں سے کسی نے کسی سے چپکے سے کہا:

''سب سے بڑے والے ہیں۔''

''ہاں''۔ دوسرا بھی اتنی ہی دھیمی آواز میں بولا۔

منجھلے کی بیوی بھائی کے لیے پانی لے کر آئیں تب بھی بھائی کچھ نہیں بولے۔ پانی لے کر پیا اور دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے۔ فاتحہ کے بعد کھانا شروع ہوا۔ بھائی سے پوچھا گیا تو انھوں نے کمزور سی آواز میں صرف اتنا کہا:

''بعد میں۔'' ایسا لگ رہا تھا جیسے انھیں بولنے میں دقت ہو رہی ہو۔ کھانا کھا کر جب باہر سے آنے والے چلے گئے تو منجھلے کی بیوی نے بھائی سے پوچھا:

''اب لاؤں؟''

''لے آؤ۔'' انھوں نے کہا۔

بھائی کھانا کھانے بیٹھے لیکن دو۔ چار نوالے کھا کر رک گئے اور سینی کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا۔

''لے جاؤ۔'' انھوں نے منجھلے کی بیوی سے کہا۔

''کچھ اور کھا لیجیے۔''

''جی نہیں کرتا۔''

''کچھ اور پکا دوں؟''

''نہیں بھوک نہیں ہے۔'' پھر کہا: ''مجھے یاد تھا آج جمعرات ہے۔'' پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولے:

''ماں کی قبر پر سے ہو کر آ رہا ہوں۔''

پھر منجھلے کے دونوں بچوں کو جو آنگن میں کھیل رہے تھے آواز دے کر بلایا اور انھیں اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا: ''ماں ان کا بہت خیال رکھتی۔'' پھر مجھ سے بولے:

''اس بار بھی تم سے ملے بغیر چلا گیا۔ مالک مکان سے چابی مل گئی تھی؟''

''مل گئی تھی۔ وہ مکان میں نے چھوڑ دیا ہے۔''

''کب؟''

''آپ کے جانے کے ایک دو روز بعد۔''

''نیا گھر کہاں ہے؟''

''اسی محلے میں، لیکن اس سے بڑا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں جگہ بہت ہے اور نیچے کا حصہ ہے۔'' پھر ان سے پوچھا: ''کل آپ واقعی قبرستان گئے تھے؟''

''واقعی مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں گیا تھا، آپ نظر نہیں آئے۔''

''جمشید کے جنازے میں؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ہاں۔لیکن جمشید کی خبر آپ کو کیسے ملی؟''

''جب میں تھانے میں تھا، لوگ اس کے زخمی ہونے کی بات کر رہے تھے اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ بچے گا نہیں۔''

''لیکن مرنے کی خبر آپ کو......''

''میرے ساتھ پکڑے جانے والوں میں سے کل ایک ملا تھا۔'' انھوں نے کہا:

''اسی نے بتایا کہ جمشید آج مر گیا۔''

''قبرستان میں آپ کس وقت تھے؟''

''جب گورکن جمشید کی قبر پر پانی چھڑک رہا تھا۔''

''اسی وقت، قبر کی مٹی برابر ہونے کے بعد میں وہاں سے نکلا تھا۔''

''ماں کی قبر اچھی حالت میں نہیں ہے۔'' بھائی نے کہا پھر منجھلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:

''یہ تو کچھ کریں گے نہیں۔تم ہی ٹھیک کراؤ۔''

''گورکن سے بات کی ہے میں نے، وہ کسی کاریگر سے بات کرے گا، پھر مجھے بتائے گا۔''

''اور تمھیں پتہ ہے کل کیا ہوا؟'' میری بات سننے کے بعد بھائی بولے۔

''کیا ہوا؟''

''میں جب ماں کی قبر پر قرآن پڑھ رہا تھا، ایک تو بڑی مشکل سے قبر ملی۔اندازے سے پہنچا وہاں تک۔گورکن مجھے شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی کفن چور ہوں۔'' بھائی اصل بات بتاتے بتاتے بھٹک گئے تھے۔

''کیا ہوا کل؟ آپ کچھ بتا رہے تھے۔''

''ہاں۔جب میں ماں کی قبر پر قرآن پڑھ رہا تھا تو ایک عجیب بات ہوئی۔''

''کیا؟''

''مجھے لگا جیسے قبر کے اندر سے روشنی کی ایک لکیر باہر آ رہی ہو۔''

''پھر؟''

''وہ لکیر اٹھتی ہوئی بہت اونچائی تک گئی۔'' منجھلے کے گھر میں موجود لوگ بھائی کے قریب آ کر بڑے اشتیاق سے ان کی بات سننے لگے۔

''پھر؟''

''اس لکیر نے ماں کی شکل اختیار کر لی۔''

''پھر؟''

''پھر اس نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔''

''ماں تو یوں بھی آپ سے باتیں کرتی ہے۔''

''کرتی ہے۔ لیکن اس طرح کا واقعہ پہلی بار ہوا۔''

''ان کے اعمال بہت نیک تھے۔'' بھائی کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کہا۔ دوسرا بولا:

''کہتے ہیں جس کے اعمال نیک ہوتے ہیں اس کی قبر نور سے بھر جاتی ہے۔''

''کیا باتیں ہوئیں ماں سے؟'' منجھلے نے جو پہلی بار بھائی سے مخاطب ہو رہے تھے ہمّت کر کے بھائی سے پوچھا۔

''تمھیں کیا حق ہے پوچھنے کا۔'' بھائی منجھلے کی طرف دیکھ کر غصےّ سے بولے۔ ''کبھی ماں کے پاس جب وہ زندہ تھی، بیٹھ کر اس کا حال پوچھا۔'' پھر اپنی کمزور آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے بولے:

''صبح ہوتے ہی باہر نکل جاتے تھے، بھوک لگتی تو گھر یاد آتا، آتے پتیلیاں کھنگالتے، جو کچھ ملتا کھاتے، چلے جاتے۔''

''مجھے بتایئے۔ کیا باتیں ہوئیں ماں سے۔'' میں نے انھیں اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

''اکیلی ہے بہت۔''

''اکیلی تو ہو گی۔'' میں نے کہا۔ پھر پوچھا: ''کیا کہتی تھی آپ سے؟''

''کہتی تھی، جیسا میں چاہتی تھی، میری اولادوں میں کوئی ویسا نہیں بن سکا۔''
انھوں نے کہا۔ پھر بولے: ''پھر تمھیں یاد کیا، کہنے لگی چھوٹا ضرور کچھ بنے گا۔ یہ کہہ کر اس نے افسوس کیا۔''

''کیا افسوس کیا؟''

جواب دینے کے بجائے بھائی نے سر جھکا لیا اور دیر تک چپکے بیٹھے رہے۔

''کیا افسوس کیا؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''وہ کہتی تھی چھوٹے کو میں ٹھیک سے نہیں پال سکی۔'' انھوں نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''اس کا ذمہ دار میں ہوں۔''

''کیوں؟''

''عمر بھر وہ میرے لیے پریشان رہی، تمھارے لیے اسے وقت ہی نہیں ملا۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بولے: ''شکر ہے کہ تم بگڑے نہیں۔''

''مگر آپ نے میرے لیے بہت کیا۔''

''کیا کیا؟''

''بُرے دنوں سے باہر نکالا۔ اب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہوں۔''

''کچھ بن جاؤ تو ماں کو سکون ملے۔'' وہ بولے۔ پھر کہا: ''بنو گے ضرور مجھے یقین ہے۔'' پھر بات بدلتے ہوئے کہا: ''تم نے میرا خط پڑھا تھا؟''

''پڑھا تھا۔''

''کیسا لگا میری حویلی کا نقشہ؟''

''بہت عمدہ، اگر بن جائے تب۔''

''کیوں؟ تم سمجھتے ہو نہیں بنے گی؟''

''بنے گی۔ لیکن وقت لگے گا۔'' میں نے کہا۔ بھائی سے الجھنا مناسب نہیں تھا، الجھنے

پر وہ مشتعل ہو جاتے تھے۔

''میں نے ماں کو بتایا۔'' بھائی پھر حویلی والی بات کی طرف واپس آئے۔

''کیا بتایا؟''

''حویلی کے بارے میں۔ اسے بتایا کہ حویلی میں کیا کیا ہوگا۔''

''ماں نے کیا کہا؟''

''بہت خوش ہوئی، لیکن.....''

''لیکن؟''

''بولی تم نے بہت دیر کی۔''

یہ سن کر منجھلے کے گھر میں جمع لوگ بہت دیر تک چپ رہے۔ بھائی بھی بہت دیر تک کچھ نہیں بولے۔

میں اور بھائی اس رات منجھلے کے گھر میں رہے۔ بھائی نے منجھلے کی بیوی سے ضد کر کے منجھلے کے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس لٹایا۔ اس رات جب سب چلے گئے، کوئی کسی سے کچھ نہیں بولا۔ بھائی نے بھی سونے سے پہلے پرانی باتیں یاد نہیں کیں۔ صبح میری آنکھ کھلی تو بھائی اٹھ چکے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ لیکن انھیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ انھیں چائے اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ ایک۔ دو گھونٹ پینے کے بعد انھوں نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے منجھلے کی بیوی سے کہا:

''تمھیں دم کی چائے بنانا نہیں آتی۔''

''اچھی نہیں ہے؟'' منجھلے کی بیوی نے پوچھا۔

''دم کی چائے کے لیے پانی دیر تک نہیں کھولایا جاتا۔''

''دوسری بنائے دیتی ہوں۔''

''نہیں۔ تم کھانا اچھا پکاتی ہو۔ چائے چھوٹے کو بنانے دو۔'' پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''اچھی سی چائے بناؤ۔''

میں نے دم کی چائے بنائی، بھائی نے وہ چائے مزے لے لے کر پی۔ منجھلے کی بیوی

نے ان کے لیے ناشتہ بنایا۔ ناشتے کے بعد منجھلے کی بیوی نے بھائی سے کہا: ''نہا لیجیے۔ طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔''

بھائی کچھ نہیں بولے۔ منجھلے کی بیوی نے آنگن کے نل سے بالٹیاں بھر کر غسل خانے میں رکھ دیں۔ پھر بھائی سے بولیں: ''نہا لیجیے۔''

''ماں بھی اسی طرح بالٹیاں بھر بھر کر غسل خانے میں رکھتی تھی۔'' بھائی بولے۔ پھر حمام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''تمہارے نل میں بھی پانی نہیں آتا؟''

''وہاں نل نہیں ہے۔ دیواریں اٹھا کر نہانے کا انتظام کر لیا ہے۔''

بھائی ہنسے پھر نہانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنی دیر میں منجھلے کی بیوی نے منجھلے کے ایک تازہ دھلے ہوئے جوڑے پر استری کر کے اسے بھائی کے پہننے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ بھائی نہا چکے تو منجھلے کی بیوی نے استری کیا ہوا جوڑا اخبار میں لپیٹ کر غسل خانے کی دیوار پر رکھتے ہوئے کہا:

''اسے پہن کر نکلیے گا۔''

بھائی جوڑا پہن کر غسل خانے سے باہر نکلے اور نکلتے ہی منجھلے کی بیوی سے پوچھا:

''منجھلے کا ہے؟''

''جی۔''

''نہانے کے بعد بھائی کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔''

''بال سوکھ جائیں تو سر میں تیل لگا دوں۔'' منجھلے کی بیوی نے کہا۔ ''آرام ملے گا۔''

''نہیں میں تیل نہیں لگاتا۔''

''اچھا تو سر دبا دوں گی، اچھی طرح۔''

بھائی بستر پر لیٹ گئے اور جب ان کے بال سوکھ گئے تو منجھلے کی بیوی سرہانے بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگیں۔ بھائی کو بہت آرام مل رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد آنکھیں بند کیے کیے منجھلے کی بیوی سے بولے:

''ماں نے اسی طرح جب میں پانچ سال کا تھا، سر دبا دبا کر مجھے کئی پارے حفظ کرا دیے تھے۔''

''اور پانا جانا کی کتابیں بھی۔'' منجھلے نے کہا۔

''اسی سے تو اردو آئی۔'' بھائی بولے۔ ''کیا اچھی زبان تھی اسماعیل میرٹھی کی۔ اب بھی وہ کتابیں پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔''

''نہر پر چل رہی ہے پن چکّی دھن کی پوری ہے کام کی پکّی۔''

کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے:

''ماں کی وجہ سے ہم تینوں کی زبان ٹھیک ہوگئی۔ غلط بولنے پر فوراً ٹوک دیتی تھی۔''

اسی طرح کی باتیں کرتے کرتے بھائی کو نیند آ گئی۔ دوپہر بعد جب منجھلے کی بیوی کھانا پکا چکیں تو انھوں نے بھائی کو آہستہ سے جگاتے ہوئے کہا: ''کھانا کھا لیجیے۔''

بھائی اٹھ بیٹھے، اٹھتے ہی انھوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا:

''منجھلے کہاں ہیں؟''

''وہ تو گئے کارخانے۔''

''سب ساتھ کھاتے تو اچھا لگتا۔'' بھائی نے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد بھائی لیٹے تو بہت دیر تک سوتے رہے، ان کی آنکھ اس وقت کھلی جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ منجھلے بھی کارخانے سے واپس آ گئے تھے۔ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی بھائی نے ان سے کہا: ''دن کے کھانے پر تمہارا انتظار رہا۔''

''کارخانے میں کام بہت تھا، اس لیے جانا پڑا۔''

منجھلے کے دونوں بیٹے بھائی سے بہت ہل گئے تھے، جب سے وہ یہاں آئے تھے دونوں ان کے اردگرد منڈلاتے رہتے۔ اس وقت بھی ایک ان کے زانو پر بیٹھا تھا اور دوسرا بار بار ان کی پیٹھ پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ منجھلے کی بیوی باورچی خانے میں رات کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ بھائی بیٹھے بیٹھے اچانک اٹھے، منجھلے کے ایک بیٹے کو گود میں لیا اور دوسرے کی انگلی پکڑ کر گھر سے باہر نکلنے لگے۔

''کہاں جا رہے ہیں؟'' منجھلے کی بیوی نے پوچھا:

''بس یہیں سڑک تک، اِنھیں ذرا گھما لاؤں۔'' اُنھوں نے بچوں کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔ کافی دیر بعد وہ باہر سے بچوں کے ساتھ خوش خوش لوٹے۔ انھوں نے بچوں کو ٹافیاں دلوائی تھیں جنہیں وہ مزے لے لے کر چوس رہے تھے۔ بھائی آنگن میں کرسی ڈال کر بیٹھے تو منجھلے نے کہا:

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے، کل دکھا لیجیے۔''

''ہاں دارالشفا جاؤں گا۔''

''میڈیکل کالج جایئے، ڈاکٹری دوا سے زیادہ فائدہ ہوگا۔''

''نہیں مجھے حکیمی دوا سے فائدہ ہوتا ہے۔'' بھائی بولے۔ ''ہمارا تو خاندان ہی حکیموں کا ہے۔'' پھر بولے: ''ماں کو کتنے نسخے یاد تھے اور جو یاد نہیں تھے وہ بیاضوں میں لکھے ہوئے تھے۔ کتنی معجونیں اور مرکبات وہ گھر ہی پر تیار کر لیتی تھی۔'' وہ کہتے جارہے تھے: ''تمہیں یاد نہیں، ہمارے یہاں جوشاندہ اور منجن کبھی بازار سے نہیں آیا۔ کیسی کیسی جڑی بوٹیوں کے نام یاد تھے اسے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ لکھنؤ کے کون کون سے حکیموں کے کون کون سے نسخے تیر بہ ہدف ہیں اور کس کس کے ہاتھ میں شفا ہے۔'' یہ کہنے کے بعد انھوں نے کہا: ''وہی تو ہمیں حکیم خورشید کے پاس دارالشفا لے جاتی تھی۔ ان کی دوا کی ایک ہی خوراک سے فائدہ ہوتا تھا۔''

''تو کل جایئے گا دارالشفا؟'' میں نے پوچھا۔

''ضرور جاؤں گا۔'' انھوں نے کہا۔ پھر منجھلے کی بیوی سے بولے: ''صبح چائے زرا جلدی بنا دینا، حکیم صاحب۔ ٹھیک نو بجے مطب میں بیٹھ جاتے ہیں۔'' پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے:

'پہلے پہل دارالشفا کہاں کھولا گیا تھا، معلوم ہے؟''

''حضرت گنج میں، ماں بتاتی تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں! اور ماں یہ بھی بتاتی تھی کہ بادشاہ نصیرالدین حیدر نے اسے کونسل چیمبر کے سامنے بنوایا تھا۔'' بھائی نے کہا۔ پھر کہا: ''محمد علی شاہ کے زمانے میں یہ شفاخانہ اٹھ کر چوک میں آ گیا، شہر کے لوگوں کو یہاں زیادہ آسانی تھی۔''

بھائی کچھ دیر خاموش رہے، منجھلے کی بیوی سے پینے کے لیے پانی منگوایا اور پانی پینے

کے بعد پھر کہنا شروع کیا: ''ماں جب جب مجھے دارالشفا لے کر جاتی تھی، حکیم خورشید نسخہ لکھتے لکھتے اس شاہی شفا خانے کی تاریخ ضرور بتاتے تھے اور شفا خانے سے متعلق نامی حکیموں کے نام بھی بتاتے تھے۔'' پھر بھائی نے اُن حکیموں کے نام لینا شروع کر دیے۔

''آپ کو یہ نام اب تک یاد ہیں''؟ میں نے کہا۔

''حکیم خورشید بہت باتونی تھے۔'' بھائی نے کہا۔''اور چونکہ ہم بھی حکیموں کے خاندان کے تھے اس لیے وہ ہمیں حکیموں کے شجرے اور لکھنؤ کے شفا خانوں کی تاریخ بتانا نہیں بھولتے تھے۔''

''دوا لے کر یہیں آجایئے گا۔'' منجھلے کی بیوی نے باورچی خانے سے آواز لگائی۔

بھائی کو بیچ میں ان کا بولنا اچھا نہیں لگا لیکن انھوں نے کچھ کہا نہیں۔

رات کے کھانے کے لیے منجھلے کی بیوی جب دسترخوان بچھا رہی تھیں تو بھائی کا چہرہ چمک رہا تھا۔ لیکن ان کی آنکھیں کہیں کچھ ڈھونڈھ رہی تھیں۔ انھوں نے مونہہ سے کچھ نہیں کہا لیکن میں سمجھ گیا کہ انھیں ماں کی یاد آ رہی ہے۔

''ماں کی سب چیزیں تمہارے ہی پاس ہیں؟'' انھوں نے منجھلے سے پوچھا۔

''ہاں، جتنی انھوں نے مجھے دی تھیں وہ سب ہیں۔''

''سامان بہت تھا بھی کہاں اس کے پاس۔'' بھائی بولے۔''سب کچھ تو قرقی میں نکل گیا، جو بچ رہا وہ ادھر اُدھر ہو گیا۔''

''یہ دسترخوان؟''

''ماں ہی کے سامان میں تھا۔'' منجھلے بولے۔

''ہاں، اب اس طرح کے دسترخوان دکھائی نہیں دیتے۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بولے: ''کچھ مرادآبادی کٹورے اور تانبے کے گلاس بھی تھے۔''

''وہ سب ہیں۔ ماں کے فاتحے کے روز شربت انھیں کٹوروں اور گلاسوں میں رکھا جاتا ہے۔'' منجھلے نے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی

تھی۔ رات کے کسی پہر اچانک بھائی سوتے میں بڑبڑائے: ''کپتان کا کنواں..... برفی..... برفی.... کپتان کا کنواں۔''

صبح جب بھائی کی آنکھ کھلی تو میں نے ان سے کہا: ''آپ رات میں بہت بڑبڑا رہے تھے۔''

''کیا بڑبڑا رہا تھا؟''

''برفی.. کپتان کا کنواں.....''

بھائی زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے بولے: ''کل رات جب دارالشفا کا ذکر ہو رہا تھا تو یہ برفی مجھے یاد آئی تھی۔'' پھر بولے: ''ماں دارالشفا سے لوٹتے وقت یہ برفی ضرور خریدتی تھی۔ کیا مزے کی ہوتی تھی۔'' پھر انھوں نے ماں کی ایک منہ بولی بہن کا نام لیتے ہوئے بتایا:

''سکندر خالہ بتاتی تھیں جب لکھنؤ کی جگہ الہ آباد کو دارالحکومت بنایا جانے لگا تو لکھنؤ کی تعریف میں بہت کچھ لکھا گیا۔ اُسی میں یہ بھی لکھا گیا کہ کپتان کے کنوئیں کی جیسی برفی پورے ہندستان میں کہیں نصیب ہے۔'' یہ بتانے کے بعد بولے: ''کپتان فتح علی نے جب یہ کنواں بنوایا ہوگا تو سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کبھی یہاں برفی بکے گی اور کنوئیں سے زیادہ وہی برفی مشہور ہوگی۔''

یہ سب بتاتے بتاتے اچانک بھائی کو دارالشفا کا خیال آیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے: ''چائے بن گئی؟''

''بن گئی۔'' منجھلے کی بیوی بولیں۔ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں: ''اِنھوں نے اٹھتے ہی بنالی تھی۔''

بھائی نے جلدی جلدی چائے پی۔ ناشتے کے لیے منجھلے کی بیوی نے پوچھا تو بولے: ''حکیم خورشید ٹھیک نو بجے مطب میں بیٹھ جاتے ہیں، دیر ہو رہی ہے، میں چاہتا ہوں سب سے پہلے وہ مجھی کو دیکھیں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ منجھلے کے گھر سے باہر نکل گئے۔ شام کو منجھلے کی بیوی کھانے پر ان کا انتظار کرتی رہیں لیکن وہ نہیں آئے اور پھر کئی دن تک ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ نہ وہ منجھلے کے

یہاں آئے نہ ہی میری طرف۔ دو۔ تین مہینوں بعد ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ بھائی اس وقت کہاں ہوں گے۔ پھر فوراً ہی میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ہوں گے کہیں، مجھ سے کیا مطلب۔ لیکن شام ہوتے ہوتے مجھے پھر بھائی کی یاد آنے لگی۔ میری طبیعت ان دنوں ٹھیک نہیں تھی۔ گزشتہ کئی دنوں سے میں شدید نزلے اور زکام میں مبتلا تھا۔ سینہ بری طرح جکڑا ہوا تھا اور کچھ کچھ دیر بعد کھانسی کے سخت دورے پڑتے تھے۔ تمام احتیاطوں کے باوجود ہر سال اکتوبر کے مہینے میں مجھے یہ شکایت ضرور ہو جاتی تھی اور پھر پندرہ بیس روز تک سینہ جکڑا رہتا تھا۔ نزلہ بڑی مشکل سے اُکھڑتا تھا اور اکھڑنے کے بعد بھی کئی دن اذیت میں گزارنا پڑتے تھے۔ اس بار سینہ کچھ زیادہ جکڑ گیا تھا۔ انگریزی دواؤں سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔
ایک دن اسی حالت میں پرانے مالک مکان سے ملاقات ہوئی تو وہ میری حالت دیکھ کر بولا:

''بہت جکڑے ہوئے ہو۔ سینے کا معاملہ ہے، بے پروائی مت کرو۔''

''دوائیں لے رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کون سی؟''

''انگریزی۔''

''ہونہہ! نزلے زکام میں انگریزی دوائیں کام نہیں کرتیں۔'' وہ بولا۔ ''یا تو گھریلو دوائیں استعمال کرو، کڑوے تیل میں لہسن جلا کر سینے پر ملو یا دارالشفا جا کر حکیم خورشید کو دکھاؤ، ایک ہی خوراک میں فائدہ ہوگا۔''

حکیم خورشید کا نام سن کر میرا ذہن فوراً بھائی کی طرف گیا۔ جس دن وہ دارالشفا گئے تھے، اسی دن سے غائب ہیں۔

دوسرے دن مالک مکان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں نو بجے سے پہلے دارالشفا کی طرف چل پڑا۔ لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں صرف مالک مکان کے کہنے سے اس طرف نہیں جا رہا ہوں، کوئی اور چیز ہے جو مجھے حکیم کے مطب کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہے۔ بھائی کی تلاش؟ شاید ایسا ہی ہو۔ میں نے سوچا۔ دارالشفا پہنچتے ہی میں نے مریضوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا کر اپنا پرچہ بنوالیا۔ پرچہ نویس نے میرا نام لکھتے وقت میری طرف غور سے

دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ حکیم صاحب کے آنے میں ابھی دیر تھی، مریضوں کی قطار لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ مجھ سے پہلے دو۔ تین مریض اپنے پرچے بنوا چکے تھے، اس لیے ان کے بعد ہی میرا نمبر آنا تھا۔ میں ان مریضوں کے ساتھ تپائی پر بیٹھا مسلسل کھانس رہا تھا۔

''کھانسی بہت شدید ہے؟'' میرے آگے بیٹھا ہوا مریض بولا۔

''ہاں کئی دن ہو گئے۔ جا ہی نہیں رہی ہے۔''

''دکھانے آج آئے ہو؟''

''ہاں۔''

''دیر کر دی، نزلہ بگڑتا ہے تو پھیپھڑے خراب ہونے لگتے ہیں۔''

''ہاں۔ اس بار زیادہ بگڑ گیا۔''

''اس بار مطلب؟''

''مجھے ہر سال اسی مہینے میں یہ شکایت ہوتی ہے۔''

''لگ کر علاج نہیں کرایا۔''

''یہ فصلی مرض ہے۔ کچھ دن رہتا ہے، ہلکی پھلکی دواؤں سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''لیکن سینے کے معاملے میں احتیاط برتنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''ذرا سی بے پروائی سے ٹی۔ بی۔ ہو جاتی ہے اور پھر آدمی خون تھوک تھوک کر مر جاتا ہے۔ جان لیوا مرض ہے۔''

''اور تم کیوں آئے ہو؟'' میں نے بات بدلنے کے لیے اس سے پوچھا۔

''گٹھیا...... ٹھیک سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ دو قدم چلنا دشوار ہے۔'' وہ بولا۔ ''بہت علاج کرایا، کہیں فائدہ نہیں ہوا۔ اب حکیم صاحب کے پاس آیا ہوں سنا ہے بہت جلد ٹھیک کر دیتے ہیں۔''

''خاندانی مرض ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ باپ کی موت اسی مرض میں ہوئی تھی۔''

''اور تمہیں جو شکایت ہے؟'' اس نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

''نہیں خاندانی نہیں ہے۔ ماں کو بواسیر تھی اسی میں مری۔''

''اور باپ؟''

''میں چپ رہا۔''اس نے پھر پوچھا:''زندہ ہیں؟''

''نہیں۔''

''ان کی موت کیسے ہوئی۔''

''مجھے نہیں معلوم، ماں کو معلوم تھا لیکن اس نے کبھی بتایا نہیں۔''

ہم ایک دوسرے سے بات کر ہی رہے تھے کہ حکیم خورشید مطب میں داخل ہوئے۔ ان کے کرسی پر بیٹھتے ہی مریضوں کے نام پکارے جانے لگے۔ سب سے پہلا مریض کمرے میں داخل ہوا تو مجھ سے باتیں کرنے والا مریض بولا:

''یہ بتا رہا تھا خونی پیچش ہے۔ جھوائی ٹولے میں حکیم منو میاں کا علاج کرا رہا تھا، فائدہ نہیں ہوا۔ اب یہاں آیا ہے۔''پھر بولا:''آدھی زندگی علاج معالجے میں گزر جاتی ہے۔''

''اور کسی کسی کی تو پوری۔''میں نے کہا۔

''ہاں، اور بعضوں کو تو بیمار رہنے کا شوق ہوتا ہے۔''وہ بولا:''میرے باپ نے پوری زندگی دوائیں کھا کھا کر گزار دی۔ جب مرا تو اتنی دوائیں گھر میں تھیں کہ ان سے ایک دکان کھولی جا سکتی تھی۔''

پہلا مریض کمرے سے باہر نکلا تو مجھ سے باتیں کرنے والے مریض نے اس سے پوچھا:''کیا رہا؟''

''حکیم صاحب باتیں بہت عمدہ کرتے ہیں۔ آدھا مرض تو ان کی باتوں ہی سے اچھا ہو گیا۔''

''آدھا دوا سے ٹھیک ہو جائے گا۔''

''نہ بھی ٹھیک ہوا تو کیا ہے۔''

''کیوں؟ ٹھیک نہیں ہونا چاہتے۔''

''ہونا چاہتے ہیں لیکن ان کی دوا سے بھی فائدہ نہیں ہوا تو اب کسی اور کو نہیں دکھائیں گے۔''

''علاج کے بغیر تو......''مریض کہتے کہتے رکا۔

''مر جائیں گے۔ یہی کہنا چاہتے ہو۔ مر جائیں۔ اب کتنا جئیں گے۔ ستر کے اوپر ہو چکے ہیں۔'' اس کی آواز تیز ہونے لگی۔ ''پیسہ خرچ ہونے سے اچھا ہے زندگی خرچ ہو جائے۔''

بوڑھے کے اس جملے کو سن کر میں نے قیاس کیا کہ پڑھے لکھوں کی صحبت میں رہا ہے۔ اب اس مریض کو پکارا گیا جو مجھ سے بہت دیر سے باتیں کر رہا تھا۔ نام پکارے جاتے ہی وہ تیزی سے کمرے کی طرف لپکا اور بہت دیر کے بعد نکلا۔

''بہت دیر لگی۔'' اُس کے نکلتے ہی میں نے کہا۔

''ہاں، حکیم صاحب نے جتنی تفصیل سے حال پوچھا اس سے زیادہ تفصیل سے میں نے انھیں بتایا۔''

''وہ کچھ اور بتانا چاہتا تھا لیکن اسی بیچ میرا نام پکار لیا گیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو حکیم صاحب نے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھا۔ پھر میرے پرچے پر نگاہ ڈالی، پھر اس شکایت پر جو پرچے میں لکھی گئی تھی۔ حکیم صاحب نے اپنے پاس رکھے ہوئے اسٹول پر مجھے بٹھایا اور میری نبض دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

''کہاں سے آئے ہو؟''

''کٹڑے سے۔''

''کٹڑہ ابوتراب؟''

''جی۔''

''کہاں پر رہتے ہو۔''

''معدن الادویہ کے پیچھے۔''

حکیم صاحب یہ نام سن کر چونکے۔ ''حکیموں کے خاندان سے ہو؟'' انھوں نے پوچھا۔

''جی.... حکیم میرن.....''

یہ سنتے ہی حکیم صاحب نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا: ''کوئی بیس پچیس برس اُدھر وہیں سے ایک خاتون آیا کرتی تھیں، اُنھیں حکیم میرن کے خاندان کی۔''

''جی۔ وہ میری ماں تھیں، میں بھی ان کے ساتھ آتا تھا اور میرے بڑے بھائی تو

بہت آتے تھے۔'' اب کے حکیم صاحب پھر چونکے۔ ''دو ڈھائی مہینے پہلے شاید وہی آئے تھے، تمہارے بڑے بھائی۔''

''جی ضرور آئے ہوں گے، ہمیں نے انھیں آپ کے پاس بھیجا تھا۔''

''لیکن پھر دوبارہ نہیں آئے۔'' انھوں نے کہا۔ ''میں نے ایک ہفتے کی دوا لکھی تھی، کہا تھا ایک ہفتے کے بعد آکر حال بتانا۔'' پھر بولے: ''اُن کے گردوں پر ورم ہے لگ کر علاج نہیں کرایا تو......''

''وہ لگ کر علاج نہیں کرا سکتے، لگ کر تو وہ کوئی بھی کام نہیں کر سکتے۔''

''کیوں؟''

''ان کے دماغ میں خلل ہے۔''

''لیکن یہاں تو بڑی عمدہ باتیں کر رہے تھے، جیسی لکھنؤ والوں کی ہوتی ہیں۔''

''جی یہی تو رونا ہے۔ کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔ ''جب ہم ان لوگوں سے جنھوں نے انھیں اِس حال میں نہیں دیکھا ہے، یہ سب بتاتے ہیں تو برے بن جاتے ہیں۔''

''تو وہ خاتون، تمہاری ماں ماشاءاللہ ابھی......''

''مر چکی ہیں۔''

''اناللہ۔ کب؟''

''پچیس برس ہوئے۔''

''لیکن تمہارے بڑے بھائی اپنی ماں کا ذکر بار بار اس طرح کر رہے تھے جیسے وہ اب بھی انھیں کے ساتھ ہوں۔''

''جی۔ انھیں ابھی تک یقین نہیں کہ وہ مر چکی ہیں۔''

''افسوس ہوا، بڑی شائستہ خاتون تھیں۔ لکھنؤ کے حکیموں کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھیں۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بولے: ''مگر مانتی مجھی کو تھیں، علاج کے لیے کہیں اور نہیں جاتی تھیں۔''

''بچپن میں میں یہاں بہت آیا ہوں ان کے ساتھ۔''

''اچھا بتاؤ کب سے ہے کھانسی؟'' اِن باتوں کے بعد حکیم صاحب نے پوچھا۔

''یہی کوئی بیس دن سے۔''

''ہر سال اسی مہینے میں زور پکڑتی ہے۔''

''جی۔ مگر آپ کو کیسے......''

''نبض دیکھ کر ہم آگا پیچھا سب معلوم کر لیتے ہیں۔'' انھوں نے کہا۔ ''دوا لکھ رہا ہوں۔ پابندی سے کھانا انشاء اللہ تین دن کے اندر ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' پھر بولے: ''سردی بڑھے تو اوڑھے لپیٹے رہنا۔''

میں کمرے سے نکلنے لگا تو بولے: ''تمہارے بڑے بھائی دلچسپ آدمی ہیں ان سے کہنا حکیم صاحب نے بلایا ہے۔''

''پہلے ملیں تو۔''

''کیوں؟ تمہارے ساتھ نہیں رہتے۔''

''نہیں۔ وہ کسی کے ساتھ نہیں رہتے۔''

''اُنھیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے، علاج اور پرہیز نہیں کیا تو بہت جلد اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔''

میں خاموش رہا۔ حکیم صاحب مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں کیسے بھائی ہو، بھائی کا خیال نہیں رکھتے۔

کمرے سے نکل کر میں اپنی دوا کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن ابھی مجھ سے پہلے والے مریضوں کے نسخے باندھے جا رہے تھے، اس لیے میں دارالشفاء کے احاطے میں اِدھر اُدھر ٹہل کر وقت گزارنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے میں نے محسوس کیا کہ دارالشفاء کی عمارت بہت بدل چکی ہے اور اس کے بڑے صحن میں جہاں کبھی چمن ہوا کرتا تھا اب پختہ مکانات ہیں اور ان مکانوں کے باہری حصوں میں زردوزی کے کارخانے کھلے ہوئے ہیں جن میں اڈے لگے ہیں اور ان اڈوں پر تنی ہوئی ساریوں پر نوجوان کاریگر زری کا کام بنا رہے ہیں۔ احاطے میں دیر تک ٹہلنے کے بعد

میں شفا خانے کے برآمدے میں آیا تو میرا نسخہ باندھا جا چکا تھا۔ حکیم صاحب کے کمپاؤنڈر نے مجھے دو پڑیاں دیں اور ایک شیشی میں شربت۔ پھر مجھے دوا کے استعمال کا طریقہ بتایا۔ پھر کہا:

''دیکھے دیکھے سے لگتے ہو۔''

''بہت پہلے، ماں کے ساتھ آیا کرتا تھا، اس وقت بھی آپ ہی نسخے باندھتے تھے۔'' میں نے کہا۔

''دو۔ ڈھائی مہینے پہلے بھی آئے تھے؟'' کمپاؤنڈر نے پوچھا۔

''نہیں میں نہیں میرے بھائی آئے تھے۔''

''ہاں۔ ان سے تمہاری صورت بہت ملتی ہے اور آواز بھی۔ قد بھی انھیں کے جیسا ہے۔''

''جی۔''

''ان کے گردے خراب تھے۔''

''جی۔ حکیم صاحب نے ابھی بتایا۔''

''تمہارے بھائی نے نہیں بتایا؟''

''نہیں، یہاں آنے کے بعد سے وہ گھر نہیں آئے۔''

''کہاں چلے گئے؟''

''نہیں معلوم۔''

''خبر نہیں رکھتے اُن کی۔''

میں خاموش رہا۔ کمپاؤنڈر دوسرے نسخے باندھنے لگا۔

''کتنا سننا پڑتا ہے بھائی کی وجہ سے۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

دارالشفا کے آہنی پھاٹک سے باہر نکلتے ہی مجھے کپتان کے کنوئیں کا خیال آیا۔ میں نے سوچا اس طرف چل کر دیکھوں برفی اب بھی ملتی ہے یا نہیں۔ میں اس طرف گیا تو وہاں کوئی خوانچے والا نہیں تھا۔ برفی کی اصل دکان ختم ہو جانے کے بعد یہاں کچھ خوانچے والے اپنی بنائی ہوئی برفی لے کر بیٹھتے تھے اور اسے کپتان کے کنوئیں کی برفی کہہ کر بیچتے تھے۔ کنوئیں کے چاروں طرف سادہ کاروں، نگینہ فروشوں اور انگوٹھی والوں کی دکانیں تھیں۔ سادہ کاروں میں

سے بہت سوں نے ملمع سازی کا کام چھوڑ کر اب سونے چاندی کے زیورات کی تجارت شروع کر دی تھی۔ نگینہ فروش اور انگوٹھی والے اب بھی اپنے پرانے کام میں لگے تھے اور اب بھی ان کی دکانوں پر نقلی نگوں کے ساتھ عقیق، یاقوت، نیلم، فیروزہ اور پکھراج، شجری اور مونگا وغیرہ کے اصلی نگ بھی مل جاتے تھے۔ نظر والے انھیں پہچان کر مول تول کے بعد انھیں مناسب داموں میں خرید لیتے تھے۔ کپتان کے کنوئیں پر کی ان دکانوں کو دیکھنے کے بعد گھر جلدی پہنچنے کے لیے میں چوک سے پارچے والی گلی کی طرف مڑ گیا۔ اس گلی کے پار کرتے ہی بلکہ اس گلی کے بیچ ہی سے فرنگی محل کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا جس میں داخل ہونے کا ایک راستہ پرانے لکھنؤ کی خاص شاہراہ کی طرف سے بھی تھا۔ فرنگی محل سے کچھ ہی دور پر میرا گھر تھا۔ پارچے والی گلی سے گزرتے وقت میں نے اس مکان کو دیکھا جسے ماں میرے باپ کا مکان بتاتی تھی۔ بہت چھوٹی عمر میں میں یہاں اس کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ خاص خاص تقریبوں میں وہ ہم تینوں کو یہاں لاتی تھی۔ میرا باپ یہاں بہت سے لوگوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ماں نے ہمارے بار بار پوچھنے پر بھی یہ نہیں بتایا کہ باپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتا۔ باپ کا مکان جب میں نے دیکھا تھا، بہت بری حالت میں تھا اور باپ نے حالات بگڑنے کی وجہ سے اسے اسی محلے کے ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور اسی کے ساتھ وہ اپنی امارت کی آخری نشانی سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ مکان کے نئے مالک نے اس عمارت کی نوابی شان والی ساری نشانیاں مٹا کر اسے نئی طرز کی سہ منزلہ عمارت میں بدل دیا تھا۔ مکان کی بدلی ہوئی صورت کے باوجود میں نے اندازے سے ایک مقام پر نگاہ ٹھہرا کر سوچا: ''باپ یہاں مسہری پر لیٹا کرتا تھا۔ مسہری کے سرہانے کھونٹی پر اس کی سیاہ شیروانی ٹنگی رہتی تھی اور اسی کے نیچے کونے میں اس کی خوبصورت چھڑی رکھی رہتی تھی۔'' اپنا آبائی مکان بیچنے کے بعد باپ اور اس کے ساتھ رہنے والے لوگ کہاں چلے گئے مجھے نہیں معلوم۔ میں باپ کے مکان کی نئی شکل کو دیکھتا ہوا گلی سے باہر نکل آیا اور تھوڑی دیر میں اپنے گھر پہنچ گیا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے دوا کی پہلی خوراک لی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ دوا اپنا اثر کر رہی ہے۔ میرے سینے کی سوزش کم ہو رہی تھی اور کھانسی میں بھی کمی ہونے لگی تھی۔

''حکیم صاحب ٹھیک کہتے تھے۔'' میں نے سوچا۔ ''ایک خوراک میں اتنا فائدہ ہے تو

تین دن میں ضرور ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''بھائی کے گردے خراب ہیں۔'' مجھے حکیم صاحب اور کمپاؤنڈر کی بات یاد آئی اور تب میں نے سوچا کہ بھائی کو ڈھونڈنا اور لگ کر ان کا علاج کرانا ضروری ہے۔ یہ خیال آتے ہی مجھے یاد آیا کہ لگ کر ہم نے ماں کا علاج بھی نہیں کرایا تھا۔ اس کی بیماری کے زمانے میں بھائی کو اپنا ہوش نہیں تھا، منجھلے پہلے ہی گھر سے بے تعلق تھے اور میں بہت چھوٹا تھا اس لیے ماں کی بیماری کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ یوں تو عام دنوں میں بھی ماں کی طبیعت ناساز رہا کرتی تھی لیکن جس دن اس کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اس دن میرے کہنے پر ناشتے کے لیے اس نے روغنی روٹی اور بھنڈی کی سبزی پکائی تھی۔ محلے کے جس ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا وہ صحیح تشخیص نہیں کرسکا۔ کئی دن تک ماں اس کی وہی دوا پیتی رہی جو عام امراض کے لیے وہ عام مریضوں کو دیا کرتا تھا۔ ماں کی حالت جب زیادہ بگڑنے لگی تو ان کی تیمارداری کے لیے ہماری ایک عزیزہ جنہیں ماں بہت عزیز رکھتی تھی آ گئیں۔ بھائی کبھی کبھی جب انھیں ماں کا خیال آتا آ کر اسے دیکھ لیتے اور دیر تک دیکھتے رہتے پھر پوچھتے:

''ماں تم ٹھیک ہو؟''

ماں جو نقاہت کی وجہ سے ٹھیک سے بول نہیں پاتی تھی، ہاتھوں کے اشارے سے بتاتی میں ٹھیک ہوں۔ پھر وہ بڑی مشکل سے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر بھائی کو زرا جھکنے کا اشارہ کرتی اور پھر بھائی کے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر کوئی دعا مانگتی۔ منجھلے ماں کی پوری بیماری میں ایک آدھ بار آئے، کچھ دیر رکے اور عزیزہ سے اس کا حال معلوم کر کے نکل گئے۔ ان دنوں میرے کھیلنے کے دن تھے۔ میں کمپنی باغ میں دن دن بھر کھیلتا رہتا اور شام کو گھر اس وقت لوٹتا جب ماں کو یا تو دوا پلائی جا رہی ہوتی یا عزیزہ کی بیٹیاں اس کے سرہانے بیٹھی دعاؤں کی کتاب سے دعائیں پڑھ کر اس پر پھونک رہی ہوتیں۔ ماں کی حالت بگڑتی رہی لیکن کسی کو نہ تو ڈاکٹر کے بدلنے کا خیال آیا نہ کسی نے ڈاکٹر سے دوا کے بدلے جانے کی بات کی۔ اور جب ایک دن ماں کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے تو اسے ایک دوسرے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا جس نے اسے فوراً ہسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ دیا اور جب ماں ہسپتال میں داخل کرائی گئی تو اس کے آدھے سے زیادہ جسم میں زہر پھیل چکا تھا۔

''بہت دیر میں لائے۔'' یہ جملہ اس ڈاکٹر نے کہا تھا جس نے سب سے پہلے ماں کو دیکھا تھا اور میں نے اُس کا یہ جملہ اس لیے سن لیا تھا کہ میں ماں کو ہسپتال لانے والوں میں آگے آگے تھا۔ ماں کو ایک علاحدہ وارڈ میں جہاں خطرناک حالتوں والے مریض رکھے جاتے تھے، لے جایا گیا اور تیسرے دن صبح کے وقت اس کی موت ہوگئی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اس کی موت اس لیے ہوئی تھی کہ ہم نے صحیح وقت پر اس کا صحیح علاج نہیں کرایا۔ اپنی بیماری کی حالت میں ماں اگر ٹھیک سے بول پاتی تو ضرور بتاتی کہ اسے کس حکیم یا کس ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے۔ وہ اپنے مرض کو پہچان گئی تھی لیکن مرض نے اتنی جلدی اسے نیم جان کر دیا تھا کہ وہ بول کر اور نہ ہی لکھ کر بتا سکتی تھی کہ اس کا مرض کیا ہے اور شہر میں کون اس مرض کا ماہر ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ بستر پر لیٹے لیٹے اپنے مرض اور اپنے معالج کے بارے میں سوچ سوچ کر اسے ضرور یہ دکھ ہوتا ہوگا کہ وہ ان کے بارے میں دوسروں کو نہیں بتا سکتی۔ اگر وہ ان کے بارے میں کسی کو بتا سکتی تو شاید لگ کر اس کا علاج کرالیا جاتا۔

''اب مجھے بھائی کا لگ کر علاج کرانا چاہیے۔'' پرانی یادوں کا سلسلہ ٹوٹتے ہی میں نے سوچا۔ لیکن ہر بار کی طرح اس بار بھی میری پریشانی یہ تھی کہ میں بھائی کو کہاں ڈھونڈوں۔ اُنھیں ڈھونڈنے کے لیے ضروری تھا کہ میں شہر میں جہاں جہاں ان کے شناسا ہیں، ان سے دریافت کروں یا جہاں جہاں ان کے ملنے کا امکان ہوسکتا ہے وہاں وہاں جاؤں۔ لیکن طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے میں نے ان کی تلاش کو ایک۔ دو دن کے لیے ٹال دیا۔

●

حکیم صاحب کی دوا نے واقعی اثر کیا۔ تیسرے دن میرے سینے کی جلن بھی غائب ہوگئی اور کھانسی میں بھی کمی آگئی۔ میں نے سوچا کہ مطب جا کر حکیم صاحب کو بتا دوں کہ مجھے ان کی دوا سے فوری فائدہ ہوا ہے اور یہ بھی پوچھوں کہ اب دوا کی ضرورت ہے یا نہیں۔ یہ سوچتے ہی میں دارالشفا کی طرف چل پڑا۔ مطب میں آج مریضوں کی تعداد بہت کم تھی۔ میں پرچہ بنوانے پہنچا تو پرچہ نویس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ پوچھا:

''پرانے مریض ہو؟''

''ہاں۔''

''پرانا پرچہ لائے ہو؟''

''لایا ہوں۔''

''دوا چاہیے؟''

''نہیں حکیم صاحب سے حال کہنا ہے۔''

''ٹھیک نہیں ہوئے؟''

''ہو گیا ہوں لیکن پوچھنا ہے کہ دوا چھوڑ دوں یا کرتا رہوں۔''

''حال کہنے کے لیے پرچہ نہیں بنتا۔ یہی پرچہ لے کر اُن مریضوں کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔'' اس نے قطار میں بیٹھے ہوئے مریضوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایک دو مریضوں کے بعد میرا نمبر آ گیا۔ حکیم صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا: ''تم تو بالکل ٹھیک ہو۔''

''جی۔ یہی بتانے آیا ہوں۔ آپ کی دوا نے تو جادو کر دیا۔''

''شفا تو میاں اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' حکیم صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ ''ہم تو نسخہ لکھتے ہیں اور سچ پوچھو تو نسخہ بھی ہم سے وہی لکھواتا ہے۔''

''دوا کی ضرورت ہے؟'' میں نے حکیم صاحب کے سامنے نسخہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ضرورت تو نہیں ہے۔ چاہو تو تین دن اور کھا لو۔'' یہ کہہ کر انھوں نے وہی دوا نسخے پر تین دن کے لیے اور بڑھا دی۔

''اچھا یہ بتاؤ تمہارے بھائی کا پتہ چلا؟''

''نہیں۔''

''ڈھونڈا نہیں؟''

''اب ٹھیک ہوئی ہے طبیعت، کل سے نکلوں گا۔''

''ڈھونڈو اور جتنی جلد ہو میرے پاس لے کر آؤ۔'' انھوں نے کہا۔ پھر کہا:

''ان کے گردے خراب ہیں، پیشاب کسی بھی وقت بند ہو سکتا ہے۔ اور پیشاب بند ہوا تو.....'' وہ کہتے کہتے رکے۔

''حالت بگڑ سکتی ہے۔'' میں نے ان کا جملہ پورا کر دیا۔

''ہاں۔''

''کل سے نکلوں گا۔ جیسے ہی ملیں گے، آپ کے پاس لاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

پھر پوچھا:

''آپ بھائی کے لیے بہت فکرمند ہیں۔''

''ہم یہاں مریضوں کو ٹھیک کرنے اور ان کی جان بچانے کے لیے بیٹھے ہیں۔'' حکیم صاحب نے کہا: پھر ذرا رک کر بولے: ''کوئی بات ہے ان میں جو میں ان کے لیے فکرمند ہوں۔''

''کیا بات ہے؟''

''بتا نہیں سکتا۔ بس یوں سمجھو کہ وہ اُن مریضوں میں ہیں جنھیں معالج عزیز رکھنے لگتے ہیں۔''

''تو پھر میں آج ہی سے نکلتا ہوں انھیں ڈھونڈنے۔'' یہ کہہ کر میں حکیم صاحب کے کمرے سے باہر نکل آیا اور نسخہ لے کر کمپاؤنڈر کی کھڑکی پر پہنچ گیا اور جب نسخہ کمپاؤنڈر کے آگے بڑھایا تو نسخہ دیکھے بغیر اس نے کہا:

''بہت جلد ٹھیک ہو گئے۔''

''آپ نے پہچان لیا؟''

''پہچانوں گا کیوں نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک بار جس مریض کو دیکھ لیتا ہوں، اس کی پوری کیفیت کے ساتھ اسے یاد رکھتا ہوں۔'' پھر بولا: ''اب دوا کی کیا ضرورت ہے۔''

''حکیم صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے، پھر خود ہی تین دن کے لیے بڑھا دی۔''

''کھا لو۔ اچھا ہے۔ شکایت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔'' کمپاؤنڈر بولا۔ پھر پوچھا:

''اور وہ تمہارے بھائی۔ کچھ پتہ چلا۔''

''نہیں۔''

''ابھی تک نہیں؟''

''ہاں، میں نے ڈھونڈا نہیں۔''

''کیوں نہیں ڈھونڈا؟''

''طبیعت کی وجہ سے۔ اب ٹھیک ہوئی ہے تو ڈھونڈوں گا۔''

''خطرناک مرض ہے۔ تم جانو۔''

''کس کی بات کر رہے ہیں؟'' میرے پیچھے کھڑے ہوئے مریض نے کمپاؤنڈر سے پوچھا۔

''اِن کے بھائی کی۔ گردوں کا مرض ہے۔ بغیر علاج کے گھوم رہے ہیں اور انھیں کہیں ملتے بھی نہیں۔''

''گورے رنگ کے ہیں؟'' مریض نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''بال بڑھے ہوئے ہیں۔''

''ہاں۔''

'آواز بہت اچھی ہے۔''

''ہاں۔''

''بولتے بہت اچھی طرح ہیں؟''

'ہاں۔ بہت اچھی طرح بولتے ہیں۔''

''کمپنی باغ جائیے، وہیں کل دیکھا تھا،'' مریض بولا۔'' آغا سودائی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔''

''یہ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نواب آغا۔ بڑے وثیقہ دار تھے، بہت سی جائدادوں کے مالک۔'' وہ بولا: ''وثیقہ اور جائداد بیچ بیچ کر کھاتے رہے، جب کچھ نہیں رہا تو پاگل ہو گئے۔ تب سے آغا سودائی کے نام سے مشہور ہیں۔'' یہ بتانے کے بعد بولا: ''اُن سے بیٹھے انگریزی پڑھ رہے تھے۔ بار بار پیشاب کے لیے اٹھتے تھے۔ آغا سودائی نے ٹوکا تو بولے گردے خراب ہیں۔'' پھر کچھ ٹھہر کر بولا: ''بہت کمزور لگ رہے تھے۔''

مریض کی بات سن کر کمپاؤنڈر بولا: ''کمپنی باغ تو بہت قریب ہے۔ گول دروازہ پار کر کے نکل جاؤ۔''

''جانتا ہوں، لڑکپن کا زیادہ وقت وہیں کھیلتے گزرا ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے کمپاؤنڈر سے دوالی اور کمپنی باغ کی طرف چل دیا۔ انگریزوں کے زمانے میں یہ جگہ کمپنی باغ کے نام سے مشہور تھی۔ آزادی کے بعد اسے کھیل کے میدان میں بدل دیا گیا لیکن کھیل کا یہ میدان کمپنی باغ ہی کے نام سے جانا جاتا رہا۔ آس پاس کے لوگ کھیلنے اور چہل قدمی کرنے یہیں آتے تھے۔ لیکن اب کھیل کا یہ میدان ویران پڑا تھا اور سنا یہ جا رہا تھا کہ حکومت اس زمین پر رہائشی مکانات اور ایک بڑا بازار بنانے والی ہے۔ کمپنی باغ میں داخل ہو کر میں نے بھائی کو چاروں طرف ڈھونڈنا شروع کیا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ البتہ ایک گھنے پیڑ کے نیچے ایک بڑی سی گٹھری اور ایک لپٹا ہوا بستر نظر آیا۔ میں گٹھری اور بستر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ پاس کے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا:

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''آغا سودائی یہیں ملتے ہیں؟''

''ہاں یہیں ملتے ہیں۔ اس وقت کہیں نکلے ہوئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ پھر پوچھا: ''کیا کام ہے؟''

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے اس سے پوچھا: ''کوئی اور بھی ہے ان کے ساتھ؟''

''ہاں۔ کچھ دنوں سے کوئی آ رہا ہے۔ روز۔''

''کون ہے؟''

''نام نہیں معلوم۔ ایک بیمار سا آدمی ہے۔''

''وہ آدمی یہیں رہتا ہے، اُن کے ساتھ؟''

''نہیں۔ کہیں اور سے آتا ہے۔ کبھی بہت جلدی چلا جاتا ہے، کبھی دیر دیر تک بیٹھا رہتا ہے۔''

''اور یہ آغا سودائی؟ ہمیشہ یہیں رہتے ہیں؟''

''ہاں۔ یہیں رہتے ہیں، اسی پیڑ کے نیچے۔'' وہ بولا۔ ''دن کے کسی پہر میں کہیں چلے جاتے ہیں، لیکن شام ہوتے لوٹ آتے ہیں۔ لیکن تم کون ہو؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''بیمار والے آدمی کو دیکھنے آیا ہوں۔''

''کیوں؟''

''بہت دنوں سے غائب ہیں اپنے گھر سے۔''

''تمہارے کون ہیں؟''

''پڑوسی۔''

''اُن کے گھر والے خود نہیں آئے؟''

''نہیں، ان کا کوئی ہے نہیں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''اور آپ؟'' میں نے اس شخص سے پوچھا۔

''کبھی یہاں کام کرتا تھا۔ کھلاڑیوں کو سامان دینے کا کام۔''

''اب؟''

''میدان دیکھ رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں۔''

''کوئی کھیلنے والا دکھائی دے رہا ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر؟ اب کیا کام ہے میرا۔'' پھر بولا: ''وہ کوارٹر دیکھ رہے ہو۔ وہیں رہتا تھا میں، اب اسے توڑا جا رہا ہے۔''

''کیا بننے جا رہا ہے یہاں؟''

''مکان، بازار۔ اور کیا۔''

اُس شخص سے باتیں کرتے کرتے مجھے خیال آیا کہ یہ لہجہ کچھ جانا پہچانا سا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا:

''آپ......ڈیگر تو نہیں!!''

''ہاں، ڈیگر ہی ہوں میں۔ تم جانتے ہو مجھے؟''

''جانتا ہوں۔ برسوں پہلے آیا کرتا تھا یہاں۔'' میں نے کہا۔ ''کھیل کا سامان آپ ہی دیا کرتے تھے۔''

''یہ سن کر اس نے ایک لمبی سانس لی۔''

''آپ کے دولڑکے بھی تھے؟''

''تھے۔ اب نہیں رہے۔''

''مطلب......!''

''دور کے شہروں میں ہیں۔ جب سے گئے، لوٹ کر نہیں آئے۔''

''اور آپ کی.....''

''بیوی؟ بہت پہلے گزر گئی۔''

''تو آپ اب بھی یہیں رہتے ہیں۔''

''اور کہاں جاؤں۔'' وہ بولا۔ پھر کہا: ''دن آغا صاحب کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ رات اس کوارٹر کے برآمدے میں، ابھی اسے نہیں توڑا گیا ہے، سو رہتا ہوں۔'' پھر بولا:

''کوئی کوٹھری کہیں خالی ہو تو بتاؤ۔''

''بتاؤں گا۔''

آغا سودائی ابھی تک نہیں آئے تھے اور اسی لیے بھائی کا بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا جب تک آغا نہیں آتے، ایک چکر کمپنی باغ کا لگا لیا جائے۔ میں نے ڈیگر کو وہیں چھوڑ کر کمپنی باغ کو دیکھنا شروع کیا۔ یہ باغ اب پہلے کا سا باغ نہیں تھا۔ اب املتاس کے وہ پیڑ کہیں نہیں دکھائی دے رہے تھے جو باغ کے چاروں طرف کچھ کچھ فاصلے پر لگے ہوئے تھے۔ املی کا وہ بڑا اور گھنا درخت بھی وہاں نظر نہیں آرہا تھا جدھر سے ہم باغ میں داخل ہوتے تھے۔ وہ درخت بھی نہیں دکھائی دے رہے تھے جن کے نیچے پڑی ہوئی پنیاں ہم دوپہر کی دھوپ میں چنا کرتے تھے اور انھیں کنچوں کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ باغ کے چاروں طرف لگے ہوئے

جنگلے بھی ہٹائے جا چکے تھے۔ اب کھیل کے اس میدان میں بہت سے مزدور اپنے ہاتھوں میں پھاوڑے لیے کھدائی کر رہے تھے۔ بس جہاں آغا سودائی کا ٹھکانہ تھا، وہیں دو۔ چار گھنے درخت باقی رہ گئے تھے۔ میں باغ کا چکر لگا کر لوٹا تو دیکھا کہ ڈیگر کے ساتھ ایک بہت بوڑھا شخص ایک میلی سی شیروانی پہنے بیٹھا ہے۔ میں اس شخص کے قریب پہنچا تو ڈیگر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہی ہیں آغا صاحب۔''

آغا نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا پھر اپنے لپٹے ہوئے بستر سے ٹیک لگا کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ آغا کو دیکھتے ہی میری نگاہ میں برسوں پہلے کے اس بوڑھے کی تصویر گھومنے لگی جو اِنھیں درختوں کے نیچے اسی لپٹے ہوئے بستر سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا تھا اور اسکول کالج کے ایک۔ دو طالب علم کتابیں کھولے اس سے انگریزی کے سبق لیا کرتے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ پاس رکھے ہوئے میلے سے گھڑے سے اپنے المونیم کے بڑے سے کٹورے میں پانی انڈیل کر پیتا اور پھر پڑھانا شروع کر دیتا۔ میں نے اس کی شیروانی دیکھی تو محسوس ہوا کہ برسوں بعد بھی اسے بدلا نہیں گیا ہے، بس اس میں کچھ پیوندوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ کھیل کے دنوں میں ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ آغا سودائی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ کھیل ختم ہونے کے بعد ہم اُنھیں دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔ اُن کا گورا رنگ، نیلی آنکھیں، سفید بال، ان کی میلی شیروانی اور ان کے انگریزی بولنے کا خاص انداز کچھ دیر کے لیے ہمیں ان کی طرف متوجہ کرتا۔ ہم نے انھیں اسی زمین کا مکین سمجھ لیا تھا جس پر وہ اپنے سامان کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔ اور حقیقتاً تھا بھی یہی۔ آغا سودائی کے سوا ہم نے کسی اور کو اس قطعۂ زمین پر آباد ہوتے نہیں دیکھا اور آج بھی زمین کا یہ ٹکڑا انھیں کے تصرف میں تھا۔ آغا اب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا اور اس پر بہت زیادہ جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ گال پچکے ہوئے تھے اور آنکھوں میں پہلی کی سی روشنی باقی نہیں رہی تھی۔ اب وہ کسی کو اس کے بہت قریب آئے بغیر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بستر سے ٹیک لگائے لگائے انھوں نے ڈیگر سے کچھ کہا تو میں نے دیکھا کہ ان کے سارے دانت گر چکے ہیں۔ میرے کھیل کے دنوں میں آغا لہک لہک

کر انھیں درختوں کے نیچے اپنے شاگردوں کو پڑھاتے تھے لیکن اب وہ بالکل خاموش تھے۔ میں نے انھیں سلام کیا تو انھوں نے جواباً سر کو خفیف سی جنبش دے دی۔

''آج کل آپ کے پاس کوئی صاحب......'' میں کچھ دیر کے لیے رکا پھر جملہ مکمل کرتے ہوئے بولا:

''روز آتے ہیں۔''

آغا نے میری طرف دیکھا پھر نحیف سی آواز میں کہا:

''آتے ہیں......بلکہ آتے ہی ہوں گے۔ آپ کون ہیں؟ تشریف رکھیے۔'' انھوں نے بہت شائستہ لہجے میں اپنے بستر کے پاس مجھ سے بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ میں بیٹھا تو وہ بولے:

''کہاں سے آئے ہیں؟''

''نخاس کی طرف سے۔''

''انھیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''کئی دن سے گھر نہیں آئے ہیں، بیمار ہیں اس لیے گھر والے پریشان ہیں۔''

''گھر والوں کے بارے میں تو انھوں نے کبھی بتایا نہیں۔''

''نہ بتایا ہوگا، لیکن گھر والے ہیں ان کے۔'' میں نے کہا پھر پوچھا: ''یہاں کب سے آ رہے ہیں؟''

''یہی کوئی ایک مہینہ ہوا ہوگا۔'' یہ کہہ کر آغا نے پوچھا: ''آپ ان کے گھر والوں میں سے ہیں؟''

''نہیں میں گھر والا تو نہیں ہوں، لیکن گھر والوں ہی نے مجھے بھیجا ہے۔''

''تو انتظار کیجیے۔ آ رہے ہوں گے۔'' انھوں نے کہا پھر بولے: ''آتے تو روز ہیں، ناغا نہیں کرتے کسی دن۔''

''وہ یہاں کیوں آتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں آتے ہیں۔ بھئی یہ بھی عجیب سوال ہے۔'' آغا سودائی نے میری طرف

تیوریاں چڑھا کر دیکھا۔ ایسا کرتے ہوئے ان کے چہرے کی جھریاں سمٹ گئی تھیں۔ پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولے:

''میرے پاس بیٹھنا انھیں اچھا لگتا ہے۔''

''انگریزی پڑھتے ہیں آپ سے؟''

''ہاں، انگریزی بھی پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ بہت دل چسپ آدمی ہیں۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بولے: ''ہم دونوں میں ایک بات ملتی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''گزرے ہوئے زمانوں کی باتیں۔ میں انھیں بہت پہلے کی باتیں بتاتا ہوں اور وہ مجھے ادھر تیس پینتیس برس پہلے کی۔'' وہ بولے۔ پھر تعریفی انداز میں کہا:

''اُن کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ باتیں یوں بتاتے ہیں کہ پورا منظر آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے۔''

''آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں اور میرے ساتھ کے سب لوگ آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔'' میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''کوئی تیس برس پہلے ہم یہاں کھیلنے آیا کرتے تھے۔''

''اور میں اس سے بہت پہلے سے یہاں ہوں۔''

''جی۔ اور ہر وقت کوئی نہ کوئی آپ کے پاس بیٹھا انگریزی پڑھ رہا ہوتا تھا۔''

''ہاں۔'' انھوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ پھر کہا: ''لیکن اب نہیں پڑھایا جاتا۔''

ع ''مضمحل ہو گئے قویٰ غالب۔'' انھوں نے غالب کا یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

''اردو سمجھ لیتے ہیں؟''

''میں اردو والا ہی ہوں۔''

''اچھا! اب تو اردو جاننے والے بھی نہیں رہ گئے۔ وہ بولے۔ پھر کہا: آپ جس زمانے کی بات کر رہے ہیں ان دنوں شام کے وقت یہ جگہ بہت آباد رہتی تھی۔ بالائی اور نشیبی دونوں میدانوں میں کھیل ہوتے رہتے تھے۔'' وہ بولتے رہے: ''اوپر کے میدان پر تو بڑی گہما گہمی رہتی۔ چاروں طرف شائقین کا مجمع اور میدان میں نامور کھلاڑی۔'' وہ کچھ دیر کے لیے رُکے پھر پاس رکھے ہوئے گھڑے سے اپنے برسوں پرانے کٹورے میں پانی انڈیل کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے: ''پئیں گے؟''

''جی شکریہ۔'' میں نے کہا۔

انھوں نے وہ کٹورا اپنے ہونٹوں سے لگایا اور پانی پی چکنے کے بعد مجھ سے پوچھا:

''جی تو کیا کہہ رہا تھا میں؟''

''دونوں میدان.......''

''ہاں۔ کیسے عمدہ کھلاڑی تھے فٹ بال کے۔ شلّی، اغن، رئیسو، قاسم.... کس کس کے نام لوں۔ ہادی اور ناصر گنّی۔ کیا برق رفتار کھلاڑی تھے۔ میدان میں ہوتے تو نہ بال نظر آتا نہ اُن کی ٹانگیں۔'' پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولے:

''پتہ نہیں یہ سب زندہ ہیں کہ مر گئے؟''

''کچھ زندہ ہیں، کچھ مر گئے اور کچھ پاکستان چلے گئے۔''

''کون کون گیا؟''

''شلّی، اغن اور رئیسو۔'' میں نے کہا۔ ''شلّی اور اغن مر چکے۔ رئیسو ابھی زندہ ہیں۔''

''اور وہ چیت علی سبزی فروش....؟ بہت شوق تھا اسے ریفری بننے کا۔ سیٹی ہونٹوں میں دبائے پورے میدان میں ناچتا رہتا تھا۔''

''مر چکا وہ بھی۔ دس برس پہلے۔''

''بہت خیال رکھتا تھا میرا۔ میدان میں جانے سے پہلے مجھے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور دے کر جاتا۔'' انھوں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''آپ کے پاس آنے والے آئے نہیں ابھی تک۔'' میں نے بات بدلی۔

''آجانا چاہیے۔ کہیں پھنس گئے ہوں گے۔''

''وہ آپ کو کون سی باتیں بتاتے ہیں؟''

''اپنی طرف کی۔ میں تو برسوں سے ادھر گیا نہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔''

''صحیح بتاتے ہیں۔ بس ایک دو عمارتیں ہیں جنھیں شاید آپ پہچان لیں۔ اندر سے وہ بھی نہیں پہچانی جاتیں۔''

''عترت منزل ہے اپنی جگہ پر؟'' انھوں نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''افضل محل؟''

''ہے لیکن اندر سے بہت بدل گیا ہے۔''

''جس عمارت میں رفیق حسین مطب کرتے تھے۔ وہ؟''

''پہلے جیسی نہیں رہی۔ اور رفیق حسین کا بھی انتقال ہو گیا۔''

''شہنشاہ منزل؟''

''وہاں اب چار منزلہ عمارت ہے۔''

اس کے بعد آغا نے کچھ نہیں پوچھا۔ کچھ دیر تک وہ خالی خالی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتے رہے۔

''آپ تو اُدھر کشمیری محلّے میں.........''

''رہتا تھا کبھی۔'' میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑے۔ ''اُن باتوں کو مت یاد دلائیں۔ پچاس برس سے اِنھیں درختوں کے نیچے رہ رہا ہوں۔'' پھر ڈیگر کی طرف دیکھتے ہوئے بولے: ''اِن کا ٹھکانہ اُجڑ چکا ہے۔ پیڑ کٹ جائیں گے تو میں بھی، اگر زندہ رہا، کہیں اور چلا جاؤں گا۔'' پھر کچھ دیر چپ رہ کر بولے:

''تو یہ صاحب جو میرے پاس آتے ہیں، آپ ان کے لیے اتنا پریشان کیوں ہیں؟''

''پڑوسی ہیں۔ بہت بیمار ہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر کہا: ''گردے خراب ہو چکے

ہیں۔ گھر والے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں، لیکن نہیں رہتے ان کے ساتھ۔''

''گھر والوں نے کہیں دکھایا اُنھیں؟''

''حکیم خورشید کو۔ دارالشفا والے حکیم خورشید۔''

''وہ تو بہت اچھے حکیم ہیں۔''

''لیکن یہ لگ کر علاج نہیں کراتے۔''

''وہ تو میں بھی نہیں کراتا۔ حکیم خورشید ہمارے دور کے عزیز ہیں۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بولے: ''کئی بار مجھے یہاں دیکھنے آئے۔ یہ بھی کہا کہ ہسپتال میں رہنے کی جگہ ہے۔ مگر میں نہیں گیا۔''

''کیوں؟''

''میں قیدی بن کر نہیں رہنا چاہتا۔''

''لیکن وہاں آپ کی اچھی طرح دیکھ بھال ہوتی۔''

''ہوتی۔ لیکن رک نہ پاتا زیادہ دن۔''

''کیوں؟''

''طبیعت......... طبیعت پابندی گوارا نہیں کرتی۔ یہاں رہتا ہوں تو یہ سوچ کر خوش رہتا ہوں کہ جس وقت جدھر چاہوں گا نکل جاؤں گا اور جب چاہوں گا واپس چلا آؤں گا۔''

''یہی مزاج اُن کا بھی ہے۔''

''کن کا؟''

''وہ جو آپ کے پاس آتے ہیں۔''

''لیکن ان کے تو گھر والے ہیں۔''

''آپ ہسپتال میں رہنا پسند نہیں کرتے اور وہ گھر میں۔'' میں نے کہا۔ پھر کہا:

''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھیے۔''

''آپ نے گھر کب چھوڑا؟''

''چھوڑا نہیں، چھوٹ گیا۔'' وہ بولے۔ پھر مجھے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے پوچھا:

''کیا عمر ہے آپ کی؟''

''چالیس کا ہو چکا ہوں۔''

''اور میں نوّے کا ہو رہا ہوں۔'' وہ بولے: ''جب آپ کی عمر کا تھا، دن بہت اچھے تھے۔ پھر برے دن آئے۔ اور......'' وہ کہتے کہتے رکے۔

''اور......؟'' میں نے پوچھا۔

''سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا۔ وثیقہ، جائداد، گرہستی، اب یہاں پڑا ہوں۔''

''آپ اکیلے نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بہت سوں کے ہاتھ سے یہ سب نکل گیا۔''

پھر پوچھا:

''لیکن آپ رہتے کہاں تھے؟''

''کشمیری محلّے میں۔ ابھی آپ اس کا نام لے چکے ہیں۔''

''میرا مطلب ہے کشمیری محلّے میں کس جگہ؟''

''جعفر علی خاں اثر کا نام سنا ہے؟''

''انھیں کون نہیں جانتا۔''

''ان کی حویلی سے بائیں طرف ایک راستہ گیا ہے۔''

''گیا ہے۔''

''پھر ایلچ خاں کا میدان ہے۔''

''ہے۔''

''وہیں تھی میری حویلی۔''

''آغا ابوّ صاحب کی.....؟''

''ہاں۔ وہ میرے والد تھے۔''

''ان کا شمار تو بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا۔''

''صحیح کہا آپ نے۔ لیکن ہم تک آتے آتے سب جاتا رہا۔ پھر بھی وہ بہت کچھ چھوڑ

کر گئے تھے۔ خیر جانے دیجیے ان باتوں کو۔'' وہ رک کے پھر بولے:

''دیکھیے وہ ابھی تک آئے نہیں۔'' ان کا اشارہ بھائی کی طرف تھا۔

''جی....اب تو رات ہونے والی ہے۔''

''کچھ دیر اور انتظار کر لیجیے، آئیں گے ضرور۔''

''نہیں۔ اب مجھے چلنے دیجیے۔ بہت کام ہیں۔ کل پھر آؤں گا۔''

''آئیں تو میں ان سے کیا کہہ دوں۔''

''یہی کہ گھر والے ان کے لیے پریشان ہیں۔'' یہ کہہ کر میں آغا سودائی کے ٹھکانے سے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اور راستے بھر بھائی اور آغا سودائی کے بارے میں سوچتا رہا۔

●

اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ کمپنی باغ کا میدان رات بھر میری آنکھوں میں گھومتا رہا اور آغا سودائی کی باتیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔ لکھنؤ کی سڑکوں پر میں نے بہت سے خستہ حالوں کو دیوانوں کی طرح گھومتے دیکھا تھا اور سب کے بارے میں یہی سنا تھا کہ یہ پرانے رئیس ہیں لیکن آغا ان سب سے الگ تھے۔ بوریہ نشینی میں بھی ان کی رئیسانہ شان دور سے نظر آتی تھی اور ان کے انکسار میں چھپی ہوئی تمکنت کو وہی پہچان سکتا تھا جس نے پرانے رئیسوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھے ہوں۔

بستر پر کروٹیں بدل بدل کر میں نے کسی طرح صبح کی۔ میرا دل بھائی میں لگا ہوا تھا اور میں انتظار کر رہا تھا کہ کسی طرح سہ پہر آئے اور میں آغا سودائی کی طرف نکلوں۔ نیند نہ آنے کی وجہ سے مجھے بہت بے چینی تھی۔ میں نے کہیں اور نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ناشتہ کیے بغیر بستر پر پڑا رہا۔ سہ پہر ہوتے ہی میں آغا سودائی کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ آغا حسب معمول ڈیگر کے ساتھ باتوں میں مصروف ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا:

''آیئے آیئے۔ آئے تھے کل وہ صاحب، لیکن آپ کے جانے کے بعد۔''

''آپ نے انھیں بتایا کہ میں آیا تھا؟''

''بتایا۔ انھوں نے اسی وقت یہ پرچہ لکھا اور کہا کہ آپ کو دے دوں۔'' آغا نے اپنی

میلی شیروانی کی جیب سے وہ پرچہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے پرچہ کھولا تو لکھا تھا:

''کیوں ڈھونڈ رہے ہو مجھے۔ میں جہاں ہوں ٹھیک ہوں۔ علاج میرا ہو رہا ہے۔ حکیمی نہیں، ڈاکٹری۔ اس مرض میں حکیم خورشید کی دوا کام نہیں کر رہی ہے۔ جہاں رہ رہا ہوں وہ لوگ اچھی طرح میری دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ماں بھی آ جاتی ہے اور دیر تک میرے پاس بیٹھی رہتی ہے۔ پچھلے جمعہ کو آئی تھی، دیر تک بیٹھی رہی۔ جب جب میں پیشاب کو اٹھتا، وہ پریشان ہو جاتی۔ مرض میرا پہچان گئی ہے۔ کہہ کر گئی ہے اگلی بار آؤں گی تو بہت سی معجونیں بنا کر لاؤں گی۔ تاکید کی ہے کہ ایسی چیزیں مت کھاؤں جس سے معدے میں گرانی پیدا ہو۔ یہ بھی کہا ہے کہ پانی خوب پیوں اور ابال کر پیوں۔ تم کو بہت پوچھ رہی تھی، کہہ رہی تھی کچھ کتابیں ہیں میرے پاس، چھوٹے کو لے جا کر دوں گی تو بہت خوش ہوگا۔ اس کے بہت کام کی ہیں۔ ہو سکتا ہے کل پرسوں میں تمہاری طرف بھی آئے۔''

تمہارا

بڑا بھائی

پرچہ پڑھ کر میں نے آغا کی طرف دیکھا، وہ کہیں اور دیکھ رہے تھے۔ میں نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''کچھ زبانی بھی کہا ہے۔''

''نہیں۔''

''کتنی دیر بیٹھے؟''

''کافی دیر۔''

''اتنے دن سے آ رہے ہیں آپ کے پاس، کبھی یہ نہیں بتایا کہ رہتے کہاں ہیں۔''

''نہیں۔ نہ میں ان سے پوچھتا ہوں، نہ وہ بتاتے ہیں۔''

''لیکن آپ ان کے لیے اتنا پریشان کیوں ہیں؟''

میں چپ رہا۔

''بتایا نہیں۔'' انھوں نے پھر پوچھا۔

''بتایا تھا آپ سے، پڑوسی ہیں۔''

یہ سن کر وہ ہنسے، پھر بولے: ''کوئی اور پڑوسی انھیں پوچھنے نہیں آتا۔''

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس لیے میں چپ رہا۔ وہ بھی کچھ دیر تک چپ رہے پھر بولے: ''یہاں سے آپ کس طرف جائیں گے؟''

''ابھی تو ان کا انتظار کروں گا۔''

''نہیں، آج وہ نہیں آئیں گے۔''

''کیوں؟''

''یہ نہیں معلوم۔ جاتے وقت یہ کہا کہ اب ایک ہفتے بعد آؤں گا۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بولے:

''یہ پہلا موقع ہے جب وہ اتنے دن کے لیے غائب ہو رہے ہیں۔''

''کچھ میرے بارے میں بتا رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ جب میں نے آپ کے بارے میں بتایا تو یہ پرچہ لکھا اور دے کر چلے گئے۔ میں نے روکا لیکن وہ رکے نہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ بھائی مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔ ایک ہفتے تک وہ آغا کے پاس اسی لیے نہیں آئیں گے کہ میں ان سے دوبارہ نہ ملنے پہنچ جاؤں۔

''آپ یہاں سے کس طرف جائیں گے؟'' آغا نے پھر پوچھا۔

''نخاس، وہاں کچھ دیر رک کر تالکٹورے کی طرف۔''

''کربلا؟''

''جی۔ ہر جمعرات کو جاتا ہوں۔''

''میں بھی جایا کرتا تھا، لیکن اب نہیں جایا جاتا۔ برسوں ہو گئے اس طرف گئے ہوئے۔''
آغا کچھ دیر چپ رہے پھر بولے:
''روضے سے کچھ پہلے میرے والد کی قبر ہے، والدہ بھی اُنھیں کے پہلو میں دفن ہیں، یاد رہے تو دونوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھ دیجیے گا۔''
''کتبے ہیں ان کی قبروں پر؟'' میں نے پوچھا۔
''ہیں، لیکن ان کی عبارتیں مٹ چکی ہیں۔'' انھوں نے کہا۔ پھر کہا: ''کربلا کی مسجد کا موذن یا اس کے گھر والوں میں سے کوئی بھی بتا دے گا کہ بڑے آغا کی قبر کہاں ہے۔'' پھر بولے:
''میں نے حکیم خورشید کے پاس بہت سا روپیہ جمع کرا دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ مجھے بھی انھیں کے برابر دفن کیا جائے۔'' پھر کہا:
''اب تو وہاں زمین کی قیمت بہت بڑھ گئی ہوگی۔''
''جی۔ بہت بڑھ گئی ہے۔ ابھی میرے ایک عزیز وہاں دفنائے گئے ہیں۔ دس ہزار دینا پڑے۔''
''دس ہزار!!!'' ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔
''جی ہاں۔''
''تب تو مجھے حکیم خورشید کو اور پیسے دینا ہوں گے۔ کفن دفن میں کسی اور کا پیسہ نہیں لگنا چاہیئے۔'' کچھ دیر چپ رہ کر آغا پھر بولے:
''سنا ہے وہاں کچھ نئی تعمیر ہو رہی ہے۔''
''ہو رہی ہے۔ لیکن لوگ بہت دیر میں جاگے۔''
''مطلب؟''
''کربلا کی اچھی خاصی آراضی تو ہاتھ سے نکل گئی۔''
متولیوں نے بیچ کھائی؟
''کچھ بیچ کھائی، لیکن بہت بڑا حصہ حکومت نے ہتھیا لیا اور اس پر ایک بہت بڑی کالونی بنا دی۔''

''اور عظیم اللہ خاں کی کربلا؟''

''اُس کی زمین بھی اسی طرح گئی۔''

''اپنی جوانی میں عاشورے کے روز جب ہم وہاں جاتے تھے تو میلوں تک آموں کے باغ تھے۔ باغوں کے آگے جہاں سے جنگل شروع ہوتا تھا، جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔''

''اب ہر طرف پکّے مکان ہیں۔ اور یہ سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے۔''

''ہم تو عشرے اور چہلم کے موقع ہی پر ادھر جاتے تھے یا پھر کسی جنازے کے ساتھ۔''

انھوں نے کہا: ''شام ہوتے ہی اس علاقے میں سناٹا ہو جاتا تھا۔'' وہ کہتے رہے:

''جب کوئی میت شام کو دفن ہوتی تو جنازے کے ساتھ گیس کی کئی لالٹینیں ہوتیں اور بہت سے لٹھ بندوں کو ساتھ لیا جاتا اس ڈر سے کہ کہیں واپسی میں ڈاکو ہمیں لوٹ نہ لیں۔''

''اب تو وہاں رات کو بھی رونق رہتی ہے۔'' وہ چپ ہوئے تو میں نے کہا۔ پھر کہا:

''آپ چل سکتے ہیں میرے ساتھ۔ سواری ہے میرے پاس۔ روضے کی زیارت بھی ہو جائے گی اور فاتحہ بھی پڑھ لیں گے۔''

''نہیں، جی نہیں چاہتا۔''

''کیوں؟''

''بڑے آغا کی قبر پر جاتے ہوئے جی لرزتا ہے۔''

''کیوں؟'' میں نے پھر پوچھا؟

''میں ان سے شرمندہ ہوں۔''

''کیوں؟''

''انھوں نے بہت کچھ چھوڑا تھا، میں نے سب اڑا دیا۔'' انھوں نے جواب دیا۔ پھر آسمان کی طرف منہ اٹھاتے ہوئے کہا:

''وہاں انھیں کوئی بتائے کہ میں اس حال میں ہوں تو انھیں بہت دکھ ہوگا۔''

''دکھ تو ہوگا۔'' میں نے کہا۔

کچھ دیر چپ رہ کر آغا بولے: ''اپنے رہتے بڑے آغا نے کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔''

''تو میں چلوں۔''میں نے جیسے ہی ان کی بات ختم ہوئی ان سے چلنے کی اجازت چاہی۔

''جائیے میاں۔ باتیں تو بہت ہیں۔ کہاں تک بتاؤں۔''میں چلنے لگا تو بولے:

''آپ جن کے لیے آتے ہیں وہ یہ باتیں بہت جی لگا کر سنتے ہیں۔''

''اب تو ایک ہفتے بعد آئیں گے۔''

''کہہ کر تو یہی گئے ہیں لیکن اس سے پہلے آجائیں گے۔''

''کیوں؟''

''کہیں اور جی لگے گا نہیں ان کا۔''

''آپ سے چھننے لگی ہے؟''

''بہت۔ بڑی عمدہ باتیں کرتے ہیں۔''

''اچھا اب اجازت دیجیے۔''میں نے دوبارہ ان سے رخصت طلب کی اور وہاں سے نکل آیا۔

●

آغا کے ٹھکانے سے میں جیسا کہ میں نے آغا سے کہا تھا، سیدھا نخاس کی طرف گیا۔ یہاں مجھے اس گورکن سے ملنا تھا جس سے میں نے ماں کی قبر ٹھیک کرانے کے لیے کسی کاریگر کو لانے کی بات کی تھی۔ میں نخاس پہنچا تو گورکن چوراہے پر ایک کاریگر کے ساتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔ میرے پہنچتے ہی اس نے کاریگر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''ان سے بات کر لیجیے۔''

''زیادہ کام نہیں ہے۔''میں نے کاریگر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔''قبر تھوڑی اونچی کر کے چاروں طرف سے برابر کرنا ہے اور اس پر ایک پتھر لگنا ہے۔''

''ہو جائے گا۔''کاریگر نے کہا۔

''یہ قبر کی پہچان کرا دیں گے۔''میں نے گورکن کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

''سامان لکھوا دو میں کل صبح پہنچوا دوں گا اور خود بھی آجاؤں گا۔''

کاریگر سے بات طے ہو جانے کے بعد میں ایک سواری میں بیٹھ کر تال کٹورے کی

طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے موذن کا ٹھکانہ تلاش کیا۔ لیکن وہ اپنے ٹھکانے پر نہیں تھا۔ میں ادھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک نوعمر لڑکے نے مجھ سے پوچھا:

''کسے دیکھ رہے ہیں؟''

''موذن کو۔''

''کیا کام ہے؟''

''تم یہیں رہتے ہو؟'' جواب دینے کے بجائے میں نے اس سے پوچھا۔

''بیٹا ہوں موذن کا۔''

''بڑے آغا کی قبر....''

''آیئے میرے ساتھ۔'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھے دو برابر سے بنی ہوئی قبروں کے پاس لے جا کر کہا: ''یہ بڑے آغا کی ہے اور یہ ان کی بیوی کی۔''

قبروں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ ان کے چاروں طرف گھاس اُگ آئی تھی اور ان پر لگے ہوئے پتھروں کی عبارتیں، جیسا کہ آغا نے بتایا تھا، مٹی ہوئی تھیں۔ لیکن جس وقت یہ قبریں بنائی گئی تھیں اس وقت ان میں بہت قیمتی پتھر لگائے گئے تھے اور ان پر مینا کاری بھی کی گئی تھی۔

''تمھیں ان قبرو کی پہچان کیسے ہے؟'' میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔

''چھوٹے آغا، اِن کے بیٹے.....'' اس نے بڑے آغا کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کچھ سال پہلے تک ہر جمعرات کو آیا کرتے تھے، یہاں بہت دیر تک بیٹھے رہتے، ابّا سے اُن کی پرانی جان پہچان ہے۔ یہاں بیٹھنے کے بعد ہمارے یہاں بیٹھتے، چائے پیتے، پھر جاتے۔'' پھر بولا: ''پتہ نہیں اب کہاں ہیں؟''

میں نے اسے آغا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

''ابّا کہاں ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''مسجد میں ہوں گے۔ اذان کا وقت ہونے والا ہے۔''

میں نے بڑے آغا اور ان کی بیوی کی قبر پر فاتحہ پڑھا۔ پھر اپنے عزیزوں کی قبریں

ڈھونڈنا شروع کیں۔ عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے بعد مجھے ایک اور قبر کی تلاش ہوئی۔ یہ قبر اس کی تھی جو ماں کے مکتب میں میری ہم جماعت تھی اور جسے ماں بہت عزیز رکھتی تھی اور سبق یاد کرتے وقت جب وہ مجھے ستاتی تھی اور میں ماں سے اس کی شکایت کرتا تھا تو ماں کہتی تھی:

''یہی بنے گی تیری دلہن۔''

سائرہ نام تھا اُس کا۔ سائرہ نے جب ماں کے مکتب میں پڑھائی ختم کی تو مکتب سے اس کا جانا مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں بہانے بہانے سے دوسرے تیسرے اس کے یہاں جانے لگا اور وہ بھی کسی نہ کسی بہانے میرے یہاں آنے لگی۔ وہ آتی تو ماں خاص طور سے اس کے لیے کچھ نہ کچھ پکاتی اور سائرہ اس میں میرا حصہ بھی لگاتی۔

مجھے گزری ہوئی باتیں اس طرح یاد آنے لگیں جیسے وہ میرے سامنے ہو رہی ہوں۔

ایک دن میں نے ماں سے پوچھا: ''سائرہ تمہیں اچھی لگتی ہے؟''

''بہت، اس نے کہا۔ بہت سے گُن ہیں اس میں۔ جب تم پڑھ لکھ کر نوکر ہو جاؤ گے تو میں اسی کو بہو بنا کر لاؤں گی۔''

سائرہ کے اجداد ایرانی تھے۔ اس کی ماں بہت خوبصورت تھیں اور بہت کم عمری میں ان کی شادی لکھنؤ کے ایک نواب زادے سے کر دی گئی تھی۔ صورت شکل میں سائرہ اپنی ماں پر گئی تھی۔ سرخی مائل رنگ، بہت نازک اور متناسب خطوط۔ ماں اکثر اسے دیکھ کر کہتی: ''کیسی گڑیا سی ہے۔'' وہ جب بھی یہ بات کہتی میں سائرہ کو دیر تک دیکھتا رہتا اور میرا جی چاہتا کہ وہ مکتب سے واپس نہ جائے۔ جس دن وہ مکتب میں نہ آتی، میرا دل پڑھائی میں نہ لگتا اور جس دن میں اسے مکتب میں نظر نہ آتا وہ فوراً ماں سے پوچھتی: ''چھوٹے کہاں ہے؟'' اور جب ماں کہتی 'مجھے نہیں معلوم' تو وہ مکتب میں چاروں طرف گھوم گھوم کر مجھے پکارتی۔ مکتب کی پڑھائی کے بعد کئی برس تک ہمارا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا رہا۔ پھر ایک دن سائرہ کے باپ جنہیں اکثر خون کی قے ہوا کرتی تھی چل بسے۔ سائرہ کی ماں نے گھر کی چیزیں بیچ بیچ کر ان کا علاج کرایا لیکن وہ ٹھیک نہیں ہوئے۔ جس دن سائرہ کے باپ کا انتقال ہوا، اسی دن سے اس کا ہمارے یہاں آنا بند ہو گیا اور ماں نے بھی مجھے اس کے یہاں جانے سے منع کر دیا۔ پھر ایک

دن خبر آئی کہ دور کے شہر میں کسی بہت سن رسیدہ شخص سے اس کی شادی کر دی گئی۔ اور پھر ایک دن، ماں کے مرنے سے کچھ پہلے، اچانک اس کے مرجانے کی خبر آئی۔ مجھے یاد ہے خبر سنتے ہی ماں رو پڑی تھی۔ روتے روتے اس نے کہا تھا:

''بھری جوانی میں گئی۔ ابھی تو شادی کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔'' پھر اس نے خبر لانے والے سے پوچھا تھا: ''ہوا کیا تھا؟ اچھی بھلی بیاہ کر گئی تھی۔''

جواب میں خبر لانے والے نے بتایا تھا:

''شادی کے بعد چپ چپ رہنے لگی تھی۔ پوچھنے پر کچھ بتاتی نہیں تھی۔ تین مہینے بعد ہی اپنی ماں کے پاس لوٹ آئی تھی۔ ماں نے واپس جانے کو بہت کہا لیکن نہ جانا تھا نہ گئی۔ کچھ دنوں سے بہت کمزور ہوگئی تھی۔ مرنے سے پہلے آپ کو بہت یاد کیا اور آپ کے چھوٹے بیٹے کو بھی۔ ماں نے آپ دونوں کو بلانے کے لیے کہا تو منع کر دیا۔ اسی کے بعد اس کا دم نکل گیا۔''

میں سائرہ کے جنازے کے ساتھ یہاں آیا تھا اور مجھے یاد ہے کہ جب اسے قبر میں اتار کر محرموں کو اس کا منہ دکھایا جا رہا تھا تو میں الگ جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر کسی کے کہنے پر جسے معلوم تھا کہ سائرہ میری ماں سے پڑھتی تھی میں نے اس کا منہ دیکھا تھا اور دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں جو نہ معلوم کیوں کھلی رہ گئی تھیں، وہی شرارت تھی جو مجھے ستانے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ میں دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر کسی نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا:

''ہٹو، پٹرے لگنے جا رہے ہیں۔''

تب میں وہاں سے ہٹ آیا اور روضے کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا اور تب تک بیٹھا رہا جب تک جنازے میں شامل سارے لوگ مٹی دے کر چلے نہیں گئے۔ سب کے چلے جانے کے بعد میں سیڑھیوں سے اٹھ کر سائرہ کی قبر تک آیا، کچھ دیر یونہی وہاں کھڑا رہا پھر جھک کر قبر پر سے تھوڑی مٹی اٹھائی اور اسے اپنے رومال میں باندھ کر کربلا سے باہر نکل آیا۔

''ابّا نماز پڑھ چکے۔'' لڑکے نے میرے قریب آ کر کہا تو میں چونکا۔ میں بڑی دیر سے سائرہ کی قبر کے پاس بیٹھا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ مجھے موذن سے ملنا ہے۔

''کہہ دو کہیں جائیں نہیں میں آ رہا ہوں۔'' میں نے لڑکے سے کہا اور سائرہ کی قبر پر شمع جلا کر مسجد کی طرف چل دیا۔

موذن وہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔ مسجد میں داخل ہو کر میں نے اس سے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا: ''آپ آغا سودائی کو جانتے ہیں؟''

''چھوٹے آغا کی بات کر رہے ہیں؟''

''جی۔''

''عزیز ہیں میرے۔ حویلیاں بھی ہماری پاس پاس تھیں۔''

''تو آپ اسی.....''

''جی۔ اسی کشمیری محلے میں رہتا تھا۔''

''یہاں کربلا میں کب سے رہ رہے ہیں؟''

''حویلی کا آخری حصہ بک جانے کے بعد۔ اتنا پیسہ نہیں تھا کہ کرائے پر رہ پاتا۔ کربلا کے متولی محلے کے ہیں۔ انھیں کی عنایت سے یہاں رہنے کی جگہ مل گئی۔''

''لیکن آپ چھوٹے آغا کو کیسے جانتے ہیں؟'' موذن نے مجھ سے پوچھا۔

''کمپنی باغ کی طرف گیا تھا۔ وہیں ملاقات ہوگئی۔''

''وہ تو ان کا برسوں پرانا ٹھکانہ ہے۔'' موذن نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں جب وہاں کھیلنے جایا کرتا تھا، اس وقت سے انھیں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ آغا سودائی کے نام سے مشہور ہیں۔''

''بہت بڑی جائداد تھی ان کی، ہم تو صرف ایک حویلی کے مالک تھے۔'' موذن نے کہا۔ ''لکھنؤ کے ہر حصے میں ان کی زمینیں اور مکان تھے۔ لیکن........'' وہ کہتے کہتے رکا۔ پھر بولا: ''بڑے آغا کا ہاتھ رکتا نہیں تھا۔ خوب اڑایا۔ چھوٹے آغا کے ہاتھ سے بھی سب نکل گیا تو دماغ پر اثر ہو گیا، بہکی بہکی باتیں کرنے لگے اور تب لوگ انھیں آغا سودائی کہنے لگے۔''

''کوئی اور بھی یہ باتیں بتا چکا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ضرور بتائی ہوں گی۔ بڑے آغا کی بربادی سے خاص و عام سب واقف ہیں۔''

پھر کچھ ٹھہر کر مجھ سے پوچھا: ''لیکن آپ ان کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''میں کربلا آ رہا تھا، جب انھیں بتایا تو کہنے لگے جا رہے ہیں تو میرے والدین کی قبر پر فاتحہ پڑھ دیجیے گا اور اگر قبریں آسانی سے نہ ملیں تو وہاں کے موذن سے پوچھ لیجیے گا۔''

''پہلے وہ ہر جمعرات کو پابندی سے آتے تھے، اب نہیں آتے۔''

''بتا رہا تھا آپ کا لڑکا۔'' میں نے موذن سے کہا۔ پھر اسے بتایا: ''بہت کمزور ہو گئے ہیں، اتنی دور پیدل نہیں آ سکتے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ بڑے آغا کی قبر پر جاتے ہوئے جی لرزتا ہے۔''

''جب آتے تھے تب بھی یہی کہتے تھے کہ آ تو جاتا ہوں، لیکن جتنی دیر رہتا ہوں، جی لرزتا رہتا ہے۔'' یہ کہنے کے بعد موذن نے کہا: ''ایک عمر کے بعد سب کو پچھتاوا ہوتا ہے اپنے کیے کا۔''

''ایک بات کہنا تھی آپ سے۔'' موذن رکا تو میں بولا۔

''کہیے۔''

''روضے کی طرف چلیے۔''

وہ میرے ساتھ روضے کی طرف آیا تو میں نے اسے سائرہ کی قبر دکھاتے ہوئے کہا:

''یہ میری عزیزہ کی قبر ہے۔ گورکن سے کہہ دیجیے کہ روز اس کی صفائی کر دیا کرے اور شام کو ایک چراغ بھی روشن کر دیا کرے۔ جو پیسے کہے گا جمعرات جمعرات آ کر دے دیا کروں گا۔''

''بہت لوگ آئے تھے اس خاتون کے جنازے کے ساتھ۔'' موذن نے قبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر بولا: ''لیکن اس کے بعد سے کسی کو یہاں چراغ جلاتے نہیں دیکھا۔''

''اسی لیے آپ سے کہا ہے۔''

''آپ بھی تو کبھی نہیں آئے۔''

''میں تو ہر جمعرات کو آتا ہوں۔ لیکن اس قبر کی طرف آتے ہوئے......''

''جی لرزتا ہے۔'' موذن بولا۔

''یہی سمجھ لیجیے۔''

''تو آج کیوں چلے آئے۔''

''رہا نہیں گیا۔ بڑے آغا کے قصے اور چھوٹے آغا کی باتوں نے پرانی یادیں تازہ کر دیں۔ یہ خاتون،'' میں نے سائرہ کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''آپ کے آگے والے محلّے وزیر باغ میں رہتی تھیں، کشمیری محلے سے ہو کر جانا پڑتا تھا وہاں۔ بڑے آغا کی قبر پر بیٹھا تو کشمیری محلّہ یاد آیا اور یوں لگا کہ میں اُسی محلّے سے ہو کر وزیر باغ کی طرف جا رہا ہوں۔'' میں نے موذن کو بتایا پھر کہا: ''وزیر باغ تو نہیں جا سکا، ادھر آ گیا، اس قبر کی طرف۔''

موذن سے سائرہ کی قبر کو صاف کرانے اور اس پر چراغ جلانے کی بات کہہ کر میں چلنے لگا تو موذن نے کہا: ''ایک پیالی چائے پی لیجیے تب جایئے۔'' یہ کہہ کر موذن نے مجھے اپنے ٹھکانے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کربلا کے اندرونی صحن کے ایک کونے پر کی دو صحنچیوں میں جہاں ایک پیڑ کا گھنا سایہ تھا، اپنے رہنے کا ٹھکانہ بنا لیا تھا اور صحنچیوں کے باہر چھوٹے سے حصے کو ٹاٹ کے پردوں سے گھیر کر اسے آنگن کی شکل دے دی تھی۔ میں اندر پہنچا تو آنگن میں بانس کی دو چارپائیاں پڑی تھیں جن کے چاروں طرف مرغیاں دوڑتی پھر رہی تھیں۔ صحنچیوں کے دروں میں بھی ٹاٹ کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ آنگن کے ایک کونے میں صفائی سے بنا ہوا مٹی کا چولہا تھا جس کے پاس المونیم کے چھوٹے بڑے کچھ برتن تھے جنھیں ابھی ابھی دھو کر رکھا گیا تھا۔ مٹی کے اس چولہے کے پاس اینٹیں رکھ کر اس پر لالٹین رکھنے کے لیے ایک اونچی سی جگہ بنا دی گئی تھی۔ چولہے سے ایک گز کی دوری پر ایک چھوٹا سا پکا چبوترہ تھا جس پر پانی سے بھری دو بالٹیاں رکھی تھیں اور وہیں پر پانی کی نکاسی کے لیے ایک پتلی سی نالی بنائی گئی تھی جو کربلا کے صحن کے باہر تک چلی گئی تھی۔ آنگن کے دوسرے کونے میں کبوتروں کی ڈھابلیاں اور مرغیوں کے ڈربے تھے اور پیڑ کی وہ شاخیں جو صحنچیوں کی چھتوں سے ہوتی ہوئی آنگن تک آ گئی تھیں، اُن پر المونیم کی باریک تیلیوں سے بنے ہوئے دو پنجرے لٹک رہے تھے۔ ان پنجروں میں الگ الگ رنگ کے پرندے تھے اور پنجروں میں دانے سے بھری چھوٹی چھوٹی کٹوریاں تھیں۔

مجھے چارپائی پر بٹھا کر موذن نے آنگن میں جھکی ہوئی دو شاخوں کے بیچ بندھی ہوئی الگنی پر ایک پردہ ڈالا پھر اپنی نواسی کو آواز دیتے ہوئے کہا:

’’فریدہ! ننا سے کہو باہر آ جائیں۔‘‘

الگنی کے پردے میں صحنچیوں اور چولہے کی طرف کا حصہ چھپ گیا تھا۔ میں چارپائی پر بیٹھا تو معاً مجھے آغا کی وہ بات یاد آئی جو انھوں نے کربلا کی زمین کی قیمت کے بارے میں کہی تھی۔ یہ بات یاد آتے ہی میں نے موذن سے پوچھا: ’’کیا دینا پڑتا ہے اب یہاں ایک قبر کا۔‘‘

’’کچھ دن پہلے تک دس ہزار تھے۔ اب بارہ ہوگئے ہیں۔‘‘ اس نے کہا پھر بولا:

’’روضے کے قریب کی زمین کے لیے تو پندرہ سے بیس تک دینا پڑتے ہیں۔‘‘

یہ سن کر میں نے سوچا کہ چھوٹے آغا کو اگر اپنے باپ کے پاس ہی دفن ہونا ہے تو انھیں حکیم خورشید کے پاس اب اور پیسے جمع کرنا ہوں گے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ موذن کی نواسی بیضاوی شکل کی ایک نقرئی کشتی میں چائے لے کر آ گئی۔ کشتی میں بہت خوبصورت چائے کی پیالیاں تھیں اور عمدہ نقاشی والی ایک طشتری جس میں بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے چائے کی کشتی، اس میں رکھی ہوئی پیالیوں اور طشتری کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

’’بہت خوبصورت ہیں۔‘‘

’’کچھ چیزیں تھیں جنھیں بچا کر رکھ لیا، انھیں میں سے یہ بھی ہیں۔‘‘ موذن نے کہا۔ پھر صحنچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

’’فریدہ کی نانی تو بہت کچھ بچا کر رکھنا چاہتی تھیں لیکن انھیں بچاتے تو کھاتے کیا۔‘‘

چائے ختم کر کے میں نے موذن سے اجازت لی اور اگلی جمعرات کو آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے نکل آیا۔

●

موذن کے ٹھکانے سے لوٹ کر میں گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ میں بہت تھکا ہوا تھا لیکن بستر پر لیٹنے سے پہلے میں نے بھائی کے لکھے ہوئے اس پرچے کی عبارت پھر سے پڑھی جسے وہ آغا سودائی کو دے کر چلے گئے تھے۔ پرچہ پڑھ کر میں نے سوچا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں جو بھائی کی اچھی طرح دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ ماں کے بہت سے عزیز تھے جو ماں کو بہت عزیز رکھتے تھے لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو بھائی کو اپنے یہاں رکھنے پر تیار ہوتا۔ ان

کے ذہنی خلل کی وجہ سے سب نے ان سے دوری اختیار کر لی تھی۔ اس لیے ماں کے عزیزوں کے یہاں ان کے ٹھہرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے کی طرح کسی مسجد یا امام باڑے میں جا کر رہنے لگے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو انھیں ڈھونڈنے کے لیے مسجدوں اور امام باڑوں کے چکر لگانا ہوں گے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ایک جگہ ہو سکتی ہے جہاں بھائی جا کر رہ سکتے ہیں۔ اُنھیں مسجدوں کی بے رونقی اور امام باڑوں کی زبوں حالی بہت پریشان رکھتی تھی۔ شہر میں جب بھی کسی مسجد یا کسی امام باڑے کو اس کی اصلی حالت پر لانے کا کام شروع ہوتا، بھائی اس میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ پچھلے دنوں شہر کے سب سے بارونق علاقے میں واقع ایک پرانے امام باڑے کو وہاں ناجائز طور پر قابض لوگوں سے خالی کرایا گیا تھا اور پرانی عمارتوں کو محفوظ رکھنے والے محکمے نے اس امام باڑے کو اس کی اصلی حالت پر لانے کی ذمہ داری لی تھی۔

''وہیں ہو سکتے ہیں بھائی۔'' میں نے سوچا اور طے کیا کہ کل شام اس طرف جاؤں گا۔ پھر مجھے یہ سوچ کر اچھا لگا کہ صبح مجھے ماں کی قبر ٹھیک کرانے کے لیے جانا ہے اور شام کو جب میں اس امام باڑے میں جاؤں گا اور بھائی وہاں ملیں گے اور میں انھیں یہ خبر سناؤں گا تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔

صبح آنکھ کھلتے ہی میں جلدی جلدی تیار ہو کر قبرستان کی طرف چل پڑا۔ کاریگر ایک مزدور کے ساتھ مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا اور گورکن نے اسے ماں کی قبر تک پہنچا دیا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو کاریگر مزدور کو ہدایتیں دے رہا تھا اور مزدور اس کی ہدایتوں کے مطابق قبر کو چاروں طرف سے صاف کر کے اس کی بگڑی ہوئی شکل کو ٹھیک کر رہا تھا۔

''بہت بری حالت میں ہے۔'' مجھے دیکھتے ہی کاریگر نے کہا۔

''ہاں۔ اب اسے بہت اچھی حالت میں ہونا ہے۔''

''اگر اب نہ ٹھیک کراتے تو دھنس جاتی۔ اس بار پانی بہت برس رہا ہے۔'' کاریگر نے کہا پھر مزدور کا ہاتھ روکتے ہوئے بولا:

''آپ کو ٹھیک سے معلوم ہے کہ یہی آپ کی ماں کی قبر ہے۔''

اس کی بات سن کر مجھے تاؤ آ گیا۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا:

''پھر کس کی ہے؟''

''نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ قبریں بہت پاس پاس ہیں اور سب ایک جیسی ہیں، مطلب کہ سب بہت خراب حالت میں ہیں۔'' کاریگر نے کہا۔ پھر بولا: ''یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ پیسے آپ لگاؤ اور قبر کسی اور کی ٹھیک ہو جائے۔''

کاریگر کے یہ کہنے پر میں چکرا گیا اور تب مجھے بھائی یاد آئے۔ وہ ہوتے تو یقین سے بتا سکتے کہ واقعی ماں کی قبر کون سی ہے۔ بھائی مل نہیں رہے تھے اور میں بلائے ہوئے کاریگر کو واپس نہیں کر سکتا تھا، اس لیے میں نے گورکن کو جو دور کسی تازہ قبر کی کھدائی میں مصروف تھا، بلا کر پوچھا:

''یہاں، اس قبر پر کسی اور کو بھی آتے دیکھا ہے؟''

''دیکھا ہے۔ ایک صاحب ہفتے میں ایک دوبار آتے ہیں اور دیر تک بیٹھے رہتے ہیں۔''

''اسی قبر پر؟''

''ہاں اسی قبر پر۔''

''اُس والی پر تو نہیں؟'' میں نے اسی کے برابر والی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں نہیں اسی قبر پر۔ ایک سپارہ اپنے ساتھ لاتے ہیں، پورا پارہ پڑھتے ہیں پھر جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے کہا: ''پارہ پڑھنے کے بعد وہ اس قبر سے ایسے باتیں کرتے ہیں جیسے مردوں سے نہیں، زندوں سے کچھ کہہ رہے ہوں۔'' پھر بولا: ''اسی وجہ سے اور بھی یہ قبر میری پہچان میں ہے۔''

گورکن سے بات کر کے میں نے کاریگر سے کہا: ''کام شروع کرو۔''

●

شام سے پہلے پہلے کاریگر نے قبر کو چاروں طرف سے برابر کر کے اس پر اچھی طرح پلاستر کر دیا تھا۔ اب اس پر پتھر لگنا تھا لیکن پلاستر کے پختہ ہونے سے پہلے اسے نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ قبر کا کام ختم ہو جانے کے بعد میں نے سوچا اب مجھے اس امام باڑے کی طرف چلنا چاہیے جہاں بھائی کے موجود ہونے کی امید ہے۔ یہ سوچتے ہی قبرستان سے نکل کر میں امام باڑے کی طرف چل دیا اور کچھ دیر بعد وہاں پہنچ گیا۔ پرانے شہر سے دور ہونے اور ایک بڑی اور کشادہ شاہراہ

کے پیچھے چھپ جانے کی وجہ سے ایک زمانے تک یہ امام باڑہ جسے سبطین آباد کا امامباڑہ کہا جاتا تھا، لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ عام لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ شہر کے اس بارونق علاقے میں کوئی امام باڑہ بھی ہے۔ امام باڑہ، بزرگ جیسا بتاتے تھے ویسا نظر نہیں آیا۔ اس کے دہرے پھاٹک بڑی خراب حالت میں تھے۔ پھاٹکوں کے اوپر کے درجوں میں لوگوں کی رہائش تھی اور نیچے کے حصوں میں دکانیں کھل گئی تھیں۔ اُس کے صحن کے چاروں طرف کی صحنچیوں میں بھی لوگ آباد ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر عیسائی تھے جنھوں نے ان صحنچیوں کی اصل صورت کو بدل کر انھیں باقاعدہ ایک رہائش گاہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ امام باڑے کی چھتوں اور دیواروں کے نقش ونگار مٹ چکے تھے اور اس کے بہت بڑے اور چوڑے چبوترے کی صفائی ایک زمانے سے نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت اُس کے اصل حصے کی دیواروں پر پاڑھ بندھی ہوئی تھی اور کچھ مزدور سنبھل سنبھل کر دیواروں کا پلاستر کھرچ رہے تھے۔ میں نے صحن میں کھڑے ہو کر امام باڑے کو چاروں طرف سے دیکھا، پھر چبوترے پر چڑھ کر اس کے وسیع ہال میں پہنچا، پھر اُس شہ نشین تک گیا جہاں شاہی زمانے کی بنی ہوئی چوبی ضریح رکھی تھی اور ضریح کے دونوں طرف وہ تعزیے رکھے تھے جنھیں شاید حال ہی میں لایا گیا تھا۔ ضریح اور تعزیوں کے پیچھے چاندی کے چمکتے ہوئے علم مختلف رنگوں کے خوبصورت پٹکوں کے ساتھ سجے ہوئے تھے۔ جب سے امام باڑہ عام لوگوں کے لیے کھولا گیا تھا، لوگ اس کی زیارت کو آنے لگے تھے۔ انھیں میں سے ایک نے ہال میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے اس کی ایک صحنچی کی طرف جہاں بہت سی لکڑیاں، بسولیاں اور رندے پڑے تھے، دیکھتے ہوئے کہا: ''بتایئے، کارخانہ کھل گیا تھا لکڑی کا یہاں۔''

''صحن میں ہر طرف عیسائی بسے ہوئے ہیں، ان کا نکالنا بہت مشکل ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

''لیکن انھیں بسایا کس نے؟'' پہلے والے نے سوال کیا۔

''وارثوں نے اور کس نے۔ چھوٹی چھوٹی رقمیں لے کر بڑی بڑی جگہیں دے دیں۔''

''محلے کے بزرگ بتاتے ہیں....'' پہلے والا بولا، ''جب واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ یہاں دفن ہوئے تھے تو انھوں نے......'' دس لاکھ کی لاگت سے اس امام باڑے کو بنوایا تھا۔'' دوسرے نے اس کا جملہ مکمل کرتے ہوئے تاریخ سے اپنی واقفیت کا مظاہرہ کیا۔

''اب کی جمعہ میں جناب نے اعلان کیا ہے کہ اگلے محرم سے یہاں با قاعدہ عزاداری ہوگی۔'' پہلے والے نے امامِ جمعہ کا فرمان سناتے ہوئے کہا۔ ''اور ہر جمعرات کو مجلسیں تا کہ امام باڑہ آباد رہے۔'' دوسرا بولا۔

میں اُن دونوں کی باتیں سنتا رہا اور امام باڑے میں چاروں طرف آنکھیں جما جما کر دیکھتا رہا لیکن بھائی کہیں نظر نہیں آئے۔ امام باڑے میں ایک گوشہ بھی ایسا نہیں تھا جہاں کوئی بسا ہوا نہ ہو۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ بھائی کے بارے میں کس سے پوچھوں کہ انھیں دونوں میں سے ایک کی آواز سنائی دی۔

''چاروں طرف قبضہ ہے اور سب کے سب غیر ہیں۔''

میں نے سوچا یہاں بسے ہوئے لوگوں سے بھائی کے بارے میں پوچھنا فضول ہے۔

''کس سے پوچھوں؟''

اسی وقت مجھے اذان کی آواز سنائی دی اور تب مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کوئی مسجد بھی ہے۔ لیکن وہ مسجد کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اور آواز کی سمت کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اُن میں سے جن کی باتیں میں بڑی دیر سے سن رہا تھا، ایک سے پوچھا:

''مسجد کدھر ہے؟''

''ہم اسی طرف جا رہے ہیں، آیئے۔'' اس نے کہا۔

مسجد میں داخل ہو کر میں نے اذان کے ختم ہونے کا انتظار کیا، اذان ختم ہوتے ہی میں نے اذان دینے والے سے پوچھا ''آپ یہیں رہتے ہیں؟''

''نہیں کہیں اور سے آتا ہوں، بتایئے۔''

''نماز پڑھ لیجیے پھر بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

مسجد میں اذان دینے والے شخص اور ان دو لوگوں کو ملا کر جو میرے ساتھ یہاں آئے تھے، ایک دو لوگ اور تھے۔ نماز ختم ہوئی تو میں نے بھائی کا ناک نقشہ بتا کر اذان دینے والے سے پوچھا:

''اس طرح کے کوئی صاحب آتے ہیں یہاں؟''

''ابھی تک تو نہیں دیکھا۔'' اس نے کہا۔ پھر بولا: ''اس سے پوچھیے جو یہاں مستقل رہتا ہو۔ میں تو قریب کے دفتر میں ملازم ہوں۔ ایک بار دن میں آتا ہوں۔ پھر دفتر سے فارغ ہو کر دوبارہ آتا ہوں اور مغرب پڑھ کر گھر چلا جاتا ہوں۔'' پھر جمعہ کے اعلان کے بارے میں بتاتے ہوئے بولا: ''جناب نے کہا ہے کہ لوگ یہاں نماز اور زیارت کے لیے آتے رہیں، اسی لیے ہم پابندی سے آتے ہیں۔'' پھر بتایا:

''جمعرات کو آیئے، بہت لوگ جمع ہوتے ہیں، شاید اس دن آپ کو مل جائیں۔''

پھر کچھ دیر رک کر بولا: ''یا پھر منتظم سے پوچھیے۔''

''منتظم ہیں کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے مسجد سے نکل کر امام باڑے کے چبوترے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''داہنی طرف کی صحنچی میں دفتر بنا رکھا ہے، وہیں دیکھیے۔''

میں وہاں پہنچا تو صحنچی کے دروازے کو مقفل پایا۔ تب میں نے وہاں مزید رکنے کا ارادہ ترک کر دیا اور طے کیا کہ اب جمعرات کو آؤں گا۔

●

میں جمعرات کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا، جمعرات آئی تو سہ پہر ختم ہوتے ہی میں سبطین آباد کے امام باڑے پہنچ گیا۔ مغرب کا وقت آتے ہی لوگ امام باڑے میں آنا شروع ہو گئے۔ ان میں سے کچھ مسجد میں نماز کے لیے چلے گئے اور کچھ امام باڑے میں رکھی ہوئی ضریح اور تعزیوں کو چومنے اور منتیں ماننے کے لیے اس کے ہال میں جمع ہونے لگے۔ میں نے ان جمع لوگوں میں بھائی کو ڈھونڈنا شروع کیا لیکن وہ نظر نہیں آئے۔ پھر میں مسجد کی طرف گیا جہاں نماز کے لیے صفیں آراستہ ہو چکی تھیں، میں بھی پچھلی صف میں شامل ہو گیا اور جیسے ہی تکبیر کی آواز بلند ہوئی میں سمجھ گیا کہ نماز کی امامت بھائی کر رہے ہیں۔ یہ آواز میں نے بہت دن بعد سنی تھی۔ اذان اور قرأت کے لیے بھائی کی خوش لحنی دور دور تک مشہور تھی، اسی لیے مسجدوں اور امام باڑوں میں رہنے سے انھیں کوئی نہیں روکتا تھا۔ جب نماز ختم ہوئی اور بھائی تسبیح و تحلیل سے فارغ ہو چکے اور جب نمازی مسجد سے باہر چلے گئے تو میں ان کے قریب پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا:

''یہاں بھی پہنچ گئے، کس نے بتایا میں یہاں ہوں۔''

''کسی نے نہیں، میرا دل کہہ رہا تھا کہ آپ یہیں ہوں گے۔''

''دل کیوں کہہ رہا تھا؟''

''کہیں بھی مسجد یا امام باڑہ بن رہا ہو اور اس کی اطلاع آپ کو ہو تو آپ وہاں ضرور پہنچتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

یہ سن کر بھائی مسکرائے۔ پھر بولے: ''بات صحیح ہے۔ برسوں سے یہ امام باڑہ ویران تھا۔ کوئی اس طرف آتا ہی نہیں تھا، آتا کیا اس کا متولی چاہتا ہی نہیں تھا کہ اس طرف کوئی آئے۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''لوگ آتے تو جو کچھ وہ کر رہا ہے، سب کی نظر میں آ جاتا۔''

''تو آپ یہاں جمعرات جمعرات آتے ہیں یا........'' میں نے بات بدلنا چاہی تو بھائی میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول پڑے:

''نہیں اب یہیں رہنے لگا ہوں۔'' پھر پوچھا:

''میرا پرچہ ملا؟''

''ملا۔''

''ماں تمہاری طرف آئی تھی؟''

بھائی کی اس بات کا جواب دینے کے بجائے میں نے ان سے کہا:

''ماں کی قبر، جیسا آپ نے کہا تھا، ٹھیک کرا دی ہے۔ ایک دو روز میں پتھر بھی لگ جائے گا اس پر۔''

یہ سن کر بھائی خوش ہوئے پھر بڑی محبت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے:

''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم بس کہہ رہے ہو، کرو گے نہیں۔''

''جا کر دیکھ لیجیے۔ چاروں طرف سے اونچی کرا کے اس پر بہت مضبوط پلاسٹر کرایا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''صبح سے شام تک وہیں کھڑا رہا۔''

''جاؤں گا ضرور جاؤں گا۔'' انھوں نے کہا پھر پوچھا:

''ماں کب مری تھی؟'' پھر خود ہی بولے: ''فروری کا مہینہ تھا شاید۔''

''جی۔ پہلی فروری۔''

''اور سنہ؟''

''سنہ ۷۰ء''

''چالیس برس ہو گئے۔''

''کچھ زیادہ۔'' میں نے کہا۔

''پتھر لکھوا کس سے رہے ہو؟'' بھائی نے پوچھا۔

''آغا حسن سے، اب لکھنؤ میں وہی ایک خطاط رہ گئے ہیں جو پتھر پر لکھنے کے ماہر ہیں۔''

''بالکل۔'' بھائی خوش ہوتے ہوئے بولے۔ پھر بولے: ''کہیں یہ اُن آغا کے عزیز تو نہیں جن سے تم ملنے گئے تھے۔''

''نہیں ان کا خاندان بالکل الگ ہے۔''

''اچھا تو پتھر پر لکھواؤ گے کیا۔ کوئی عبارت بنائی۔''

''نہیں عبارت تو کوئی نہیں بنائی۔ پیدائش اور وفات کا سنہ کافی ہے۔''

''نہیں عبارت تو ہونا چاہیے۔ کم سے کم ایک دو شعر ہی لکھوا دو۔'' بھائی نے کہا۔ پھر کچھ یاد کرتے ہوئے بولے: ''مجھے یاد ہے ماں جب مرنے کے بالکل قریب تھی تو کچھ شعر پڑھ رہی تھی۔''

''صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ مجھے بھی کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔''

بھائی کچھ دیر ذہن پر زور دیتے رہے پھر دکھ بھرے لہجے میں بولے:

''ممانی بھی تو نہیں رہیں، ہوتیں تو بتا دیتیں کون سے شعر تھے۔ انھیں کے زانو پر دم توڑا تھا ماں نے۔''

پھر شاید بھائی کو کچھ یاد آیا اور جو کچھ یاد آیا اسے انھوں نے زیرِ لب کہنا شروع کیا۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں

یاد آ جانے والا شعر پڑھنے کے بعد بولے: ''ایک تو یہ شعر لکھوا دو اور ایک .... جو

مجھے بہت پسند ہے۔''

''وہ کون سا؟''

''موت اک ماندگی کا وقفہ ہے　　　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر''

انھوں نے دوسرا شعر بتا کر ایک پرچے پر دونوں شعر لکھے پھر اس کے نیچے لکھا:

''ہمیں بھی کل یہیں آنا ہے تمہارے پاس

ع　　بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں....''

پھر پوری عبارت کا پرچہ مجھے دیتے ہوئے بولے:

''آغا صاحب سے کہنا پتھر بہت عمدہ خط میں لکھیں اور نستعلیق میں لکھیں، نسخ میں نہیں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''تم انھیں بتا دینا وہ سمجھ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے بتا دوں گا اور پتھر بھی جیسے ہی آغا صاحب لکھ لیں گے، لگوا دوں گا۔''

میرے یہ کہنے کے بعد بھائی کو کچھ اور یاد آیا۔ بولے:

''لیکن ماں پیدا کب ہوئی تھی؟''

''آپ کو نہیں معلوم؟''

''مجھے معلوم ہوتا تو میں تم سے کیوں پوچھتا۔'' انھوں نے کہا۔ پھر ناراض ہوتے ہوئے بولے:

''ابھی تم پیدائش کا سنہ بھی لکھوانے کی بات کہہ رہے تھے۔''

''جی کہہ رہا تھا، میں سمجھ رہا تھا پیدائش کا سنہ آپ کو معلوم ہوگا۔''

''باپ کو معلوم رہا ہوگا، لیکن وہ ہمارے ساتھ رہا کتنے دن۔''

''ماں نے بھی تو نہیں بتایا کبھی۔''

''نہیں، بتایا ضرور ہوگا، ہمیں یاد نہیں رہا۔'' بھائی نے کہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے:

''کس سے معلوم ہو سکتا ہے، اب کوئی رہا بھی تو نہیں اُس کے ساتھ کا۔''

''بدر جہاں سے۔'' یہ نام میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا۔

''بدر جہاں؟''

''جی۔ ماں نے جس اسکول میں بچوں کے کھانے پینے کے سامان کی دکان کھولی تھی، بدر جہاں وہیں پڑھاتی تھیں۔''

''یاد آیا۔'' بھائی بولے: ''وہ ہمارے یہاں بہت آتی تھیں۔''

''جی۔ ماں انھیں بہت کچھ بتاتی تھی۔ اپنے بارے میں، اپنے خاندان کے بارے میں۔'' میں نے بھائی کو بتایا۔ پھر کہا: ''ہوسکتا ہے انھیں اپنی پیدائش کی تاریخ اور سنہ بھی بتایا ہو۔''

''تو ان سے معلوم کرو۔ لیکن وہ زندہ ہیں ابھی...؟''

''کل جاؤں گا اس طرف، چوک میں ہے ان کی حویلی، دارالشفا سے کچھ پہلے۔'' میں نے کہا، پھر ان سے پوچھا:

''تو اب آپ یہیں رہیں گے؟''

''جب تک امام باڑے کی مرمت ہو رہی ہے، یہیں رہوں گا۔ پتھر لگ جائے تو آ کر بتانا۔''

''حکیم خورشید کے پاس گیا تھا اپنی دوا لینے.....'' کہتے کہتے میں رکا۔

''کیا ہوا تھا تمہیں؟''

''نزلہ۔ بہت زور کا۔ سینہ جکڑ گیا تھا بری طرح۔''

''بتایا نہیں مجھے۔''

''آپ ملے کہاں۔''

''اب تو بالکل ٹھیک لگ رہے ہو۔''

''ہاں اب ٹھیک ہوں۔ میں دوا لینے گیا تھا تو وہ کہہ رہے تھے.....''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''آپ کے گردوں پر ورم ہے۔''

''تو؟''

''کہہ رہے تھے لگ کر علاج نہیں کرایا تو....''

''تو؟''

''حالت بگڑ سکتی ہے۔''

''میرا پرچہ ٹھیک سے پڑھا تھا؟'' بھائی نے پوچھا۔

''پڑھا تھا۔''

''میں نے لکھا تھا ان کی دوا سے فائدہ نہیں ہو رہا ہے، اب ڈاکٹری علاج کر رہا ہوں۔''

''لکھا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ میں جہاں ہوں وہ لوگ اچھی طرح میری دیکھ بھال کر رہے ہیں۔''

''ہاں یہ بھی لکھا تھا۔''

''وہ کون لوگ ہیں؟''

''سب کچھ تمہیں کیوں بتاؤں۔ میں پوچھتا ہوں سب کچھ تمہارے بارے میں؟''

''نہیں۔''

''تو؟''

''اچھا یہ بتا دیجیے کس ڈاکٹر کو دکھا رہے ہیں؟''

''یہ بھی نہیں بتاؤں گا۔ بس یہ بتاؤں گا کہ علاج ٹھیک ہو رہا ہے۔''

''میں یہی چاہتا ہوں کہ آپ کا علاج ٹھیک سے ہوتا رہے۔''

''ہوتا رہے گا۔''

''لیکن یہاں، اس امام باڑے میں آپ کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

''کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔''

''آپ کہیں تو میں آپ کو بھرتی کرا دوں، حالت ٹھیک نہیں ہے آپ کی۔''

''نہیں بھرتی ہونے والی حالت نہیں ہے۔''

''پیشاب بہت آ رہا ہے۔ اتنی دیر میں کئی بار جا چکے ہیں۔''

''ہاں، لیکن تکلیف زیادہ نہیں ہے۔''

''کبھی کبھی اندر کی حالت باہر سے نہیں معلوم ہوتی۔ کیا پتہ کیا کیا بگڑ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر کہا: ''ہسپتال میں ہر طرح کی جانچ ہو جائے گی۔ حکیم صاحب کی تشخیص غلط نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر ایسا ہے تو دو۔ چار دن بعد دیکھوں گا۔ فی الحال بدر جہاں کا پتہ لگاؤ۔'' بھائی بولے۔ پھر بولے: ''ماں کی پیدائش کے بارے میں پتہ چل جائے تو پتھر کی عبارت پوری ہو جائے۔''

چلتے وقت میں نے بھائی کو ہفتے بھر کے خرچ کے پیسے دیے اور یہ پوچھے بغیر کہ امام باڑے کے حدود میں ان کا ٹھکانہ کہاں ہے، باہر چلا آیا۔

●

دوسرے دن میں بدر جہاں کی تلاش میں نکل پڑا۔ چوک میرے گھر سے بہت دور نہیں تھا۔ دو۔ تین پتلی پتلی گلیوں سے ہوتا ہوا میں چوک کے اندر پہنچ گیا اور جلد ہی مجھے وہ کھلی ہوئی جگہ نظر آ گئی جس کے داہنی طرف کی گلی میں خواجہ کی حویلی تھی اور بائیں طرف کی گلی میں کچھ آگے چل کر میر انیس کا مقبرہ۔ بدر جہاں اسی خواجہ کی حویلی میں رہتی تھیں۔ مجھے یاد ہے جب وہ ہمارے یہاں آتی تھیں اور جب ماں انھیں نئے مہمانوں سے ملواتی تھی تو وہ اپنے گھر کا پتہ بتاتے وقت میر انیس کے مقبرے کا حوالہ دینا نہیں بھولتی تھیں۔ لیکن یہ بہت پرانی بات ہے۔ اب چوک میں ایسے لوگ بہت کم رہ گئے تھے جو انیس کے مقبرے کا نام سن کر فوراً بتا دیں کہ وہ کہاں ہے۔ میں بائیں طرف والی گلی میں داخل ہو کر خواجہ کی حویلی کے پھاٹک پر پہنچا تو پھاٹک کے دونوں دروازے جن کی اونچائی عام دروازوں سے بہت زیادہ تھی، کھلے ہوئے تھے۔ کھلے کیا تھے انھیں عرصے سے جب سے ڈیوڑھی کی زمین ناہموار ہوئی تھی بند نہیں کیا گیا تھا۔ لمبی تاریک ڈیوڑھی کے باہر کھڑے ہو کر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اپنے آنے کی اطلاع اندر کیسے پہنچاؤں۔ ڈرتے ڈرتے میں ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو اس کا دوسرا پھاٹک بھی کھلا ہوا ملا۔ ڈیوڑھی کے اندر سے حویلی کا صحن صاف نظر آ رہا تھا اور وہ فوارہ بھی جو صحن کے بیچوں بیچ بنا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی کا آدھا حصہ طے کرنے کے بعد مجھے تیز ہوتی ہوئی کچھ آوازیں سنائی دیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ عورتیں کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہی ہوں۔ میں نے ڈیوڑھی کے دوسرے

پھاٹک کے ایک پٹ میں لٹکے ہوئے بہت بڑے لوہے کے کڑے کو زور زور سے اس پٹ پر مارنا شروع کیا۔ کافی دیر بعد جب اندر جھگڑنے والوں میں سے کچھ لوگ خاموش ہوئے تو کسی نے ڈپٹنے کے سے انداز میں پوچھا:

''کون ہے؟''

''خالہ سے ملنا ہے۔ بدر خالہ سے۔''

''یہ سن کر ایک عورت ایک ہاتھ میں سوئی تاگا اور دوسرے میں ایک چھوٹا سا کپڑا لیے ہوئے باہر آئی اور سوئی میں تاگا ڈالتے ہوئے بولی:

''کیا ہے؟''

''خالہ سے ملنا ہے۔ بدر خالہ سے میں نے پہلی والی بات کو دہرایا۔''

میری بات سن کر اس عورت نے وہیں سے آواز لگائی:

''چھوٹی بیگم۔ آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

جواباً ادھر سے ایک کمزور سی آواز آئی: ''کون ہے نام تو پوچھو۔''

میرے سامنے کھڑی ہوئی عورت نے مجھ سے پوچھا: ''کیا نام ہے آپ کا؟''

''کہہ دو عالیہ بیگم جن کی لال اسکول میں دکان تھی، ان کا لڑکا آیا ہے۔''

اس عورت نے اس بار زرا زور سے آواز لگائی:

''عالیہ بیگم جن کی لال اسکول میں دکان تھی، ان کے لڑکے آئے ہیں۔''

اب کے زرا وقفے کے بعد کہا گیا:

''سامنے بلاؤ۔''

اس عورت نے مجھ سے کہا: ''آجایئے۔''

''میں اندر گیا تو ایک بہت کمزور سی عورت حویلی کے بالائی حصے کی روکش سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے اس عورت کو سلام کرنے کے بعد کہا:

''میں ذاکر ہوں عالیہ بیگم کا چھوٹا لڑکا۔''

''علّن باجی...!''اس عورت نے ماں کا وہ نام لیا جو عزیزوں میں لیا جاتا تھا۔

پھر وہیں سے بولی: ''اچھا اچھا ٹھہرو۔''

یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئی اور میں نیچے کھڑے حویلی کے پورے صحن میں نگاہ دوڑاتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ صحن کے بیچ میں بنا ہوا فوارہ سوکھا پڑا ہے اور اس کے حوض میں صحن کے چاروں طرف آباد خواجہ کی حویلی کے پرانے ملازم اپنی کوٹھریوں کا کوڑا لا لا کر ڈال رہے ہیں۔ ان ملازموں نے صحن کے برآمدوں کو چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں بدل دیا تھا اور اب وہ یہاں اس طرح رہ رہے تھے جیسے یہ پورا صحن ان کی جاگیر ہو۔ اتنی دیر میں ان کے ہاؤ بھاؤ سے مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اب وہ یہاں کے تنخواہ دار ملازم نہیں ہیں اور مالکوں کے دو۔ چار کام صرف یہاں رہنے کی وجہ سے کر دیا کرتے ہیں۔ حویلی کے وسیع صحن میں کچھ پرانے اور گھنے درخت تھے جن کے پتے خاک سے اٹے ہوئے تھے اور جن کی شاخیں پھیلتے پھیلتے صحن کی دیواروں تک پہنچ گئی تھیں اور ان شاخوں سے پھوٹنے والی کچھ مہین ڈالیاں حویلی کی غلام گردشوں میں لگی ہوئی پتھر کی جالیوں کے خانوں میں راہ بنا کر غلام گردشوں کے اندر پہنچ گئی تھیں۔ ان غلام گردشوں کے پیچھے بنے ہوئے کمروں میں شیشم کی لکڑی کے خوبصورت دروازے تھے جن کی آرائش کے لیے اُن پر خوبصورت نقاشی کی گئی تھی اور ان کے اوپری حصے کو نیم دائرے کی شکل دے کر اس میں بیضاوی شکل کے رنگین شیشوں کو جوڑ کر ایک پنج شاخہ بنا دیا گیا تھا۔ ان دروازوں پر گرد کی تہیں جمی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں برسوں سے نہیں کھولا گیا ہے۔

''اوپر آ جاؤ۔'' اس عورت نے دوبارہ آ کر آواز لگائی اور میں سفید پتھر کی سیڑھیوں پر جو میلی ہو کر اپنا اصلی رنگ کھو چکی تھیں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔

''بہت زمانے بعد دیکھ رہی ہوں۔'' بدر جہاں نے کمزور سی آواز میں کہا۔ پھر بولیں: ''کتنے بڑے ہو گئے ہو۔ پہچان نہیں پا رہی تھی۔''

باتیں کرتے کرتے وہ مجھے ایک ایسے گوشے میں لے گئیں جو ایک بڑے کمرے کا بیرونی حصہ تھا۔ یہاں نواڑ کی دو مسہریاں پڑی تھیں جن کی توشکوں پر بہت میلی چادریں بچھی تھیں۔ ایک مسہری پر ایک بوڑھی خاتون آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔ یہ بدر جہاں کی بڑی بہن

تھیں۔ ماں بتاتی تھی کہ ان کے حسن کے چرچے دور دور تھے لیکن اب ان کے سارے بال سفید ہو چکے تھے اور ان کے پورے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں اس گوشے میں پہنچا تو انھوں نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں مسہریوں سے تھوڑی دور پر ایک کونے میں لکڑی کی ایک پرانی میز پر ایک پرانا گیس کا چولہا رکھا تھا اور اسی کے اوپر دیوار میں کیلیں ٹھونک کر پتیلیوں، ڈونگوں اور کنڈے دار پیالیوں کو لٹکا دیا گیا تھا۔ چولہے کے ایک طرف پلاسٹک کے کچھ ڈبے تھے جن پر ہاتھ لگتے لگتے میل جم گیا تھا اور دوسری طرف کچھ بڑی اور کچھ چھوٹی چینی کی طشتریاں رکھی تھیں۔ دونوں مسہریوں کے بیچ میں ایک بہت پرانا ریفریجریٹر تھا جس کی پالش جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھی اور جس کے دروازے کا نچلا حصہ زنگ کھا کھا کر غائب ہو چکا تھا، گوشے کے بالکل آخری حصے میں دیوار سے لگا ہوا لکڑی کا ایک بہت بڑا صندوق تھا جس پر پرانے کپڑے ڈھیر تھے۔

''بیٹھو۔'' بدر جہاں نے کونے میں پڑی ہوئی ایک کرسی کو جس کے پائے ہلنے لگے تھے، کھینچتے ہوئے کہا۔ میں کرسی پر بیٹھا تو انھوں نے دوپٹے سے اپنا سر ڈھکتے ہوئے پوچھا:

''کیسے آنا ہوا؟''

''بس آج ماں کے ملنے والوں کی یاد آئی، چلا آیا آپ کی طرف۔''

''کیسے ہو؟'' بدر جہاں نے مجھے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔''

''اور تم سے بڑے والے دونوں۔ اُن کے کیا حال ہیں، بڑا والا کچھ ٹھیک ہوا۔''

''نہیں۔ جیسا آپ نے دیکھا تھا ویسے ہی ہیں۔ ٹھیک ہو جاتے ہیں پھر بہک جاتے ہیں۔''

''کتنا پریشان رہتی تھیں باجی اس کے لیے۔'' انہوں نے کہا۔ پھر پوچھا:

''اور منجھلا؟''

''کاروبار میں لگے ہیں اپنے۔''

''وہی لوہے کی جڑائی والا؟''

''جی۔ لیکن اب وہی کام ٹھیکے پر شروع کر دیا ہے۔''

''اور تم؟''

''ایک دفتر میں نوکر ہوں۔''

''چائے بناؤں تمہارے لیے۔'' یہ باتیں پوچھنے کے بعد بدر جہاں کو میری خاطر کا خیال آیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ اپنی مسہری سے اٹھ کر چائے بنانے پہنچ گئیں۔ چائے کی کیتلی میں پانی بھرتے بھرتے انھوں نے دوسری مسہری پر لیٹی ہوئی عورت سے پوچھا:

''بانو! چائے بنا رہی ہوں۔ پیوگی۔''

''پی لوں گی۔'' اس عورت نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد بدر جہاں ایک کشتی میں چائے کی تین پیالیاں لے کر آئیں، اسی وقت نیچے سے آواز آئی:

''چھوٹی بیگم! تکو نے۔''

بدر جہاں ایک اسٹول پر چائے کی کشتی رکھ کر تکو نے لینے چلی گئیں جو انھوں نے نیچے رہنے والے ملازموں میں سے کسی سے میرے لیے منگوائے تھے۔ تکو نے پلیٹ میں رکھ کر پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا:

''لو۔ قیمے کے ہیں۔ یہیں چوک میں بنتے ہیں۔''

پھر انھوں نے اپنی بہن کو سہارا دے کر اٹھایا اور ان کی پشت پر دو۔ تین تکیے لگا کر انھیں اس طرح بٹھا دیا کہ وہ چائے آسانی سے پی سکیں۔ بانو جب تکیوں سے پیٹھ لگا کر بیٹھیں تب میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ ان کی جلد اس حد تک ڈھیلی پڑ چکی تھی کہ لٹکنے لگی تھی۔ انھوں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے چائے کی پیالی تھامی اور میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

''یہ کون ہیں؟''

''علّن باجی کا چھوٹا لڑکا۔''

''کون علّن؟'' بانو نے یاد کرنے کے سے انداز میں پوچھا۔

''بزازے والی۔''

''عالیہ بیگم جو تمہارے اسکول میں دکان لگاتی تھیں؟''

''ہاں وہی۔ تم بھی تو وہاں کئی بار گئی ہو میرے ساتھ۔''

''ہاں ہاں۔ اچھا بڑا مکان تھا ان کا۔''

''لیکن اب نہیں ہے۔'' بدر جہاں نے انھیں بتایا۔ ''بہت پہلے........'' جملہ پورا کرنے سے پہلے انھوں نے میری طرف دیکھا اور میں نے ان کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا:

''قرق کر لیا گیا۔ گروی تھا مہاجن کے پاس۔''

''سودا تو ہماری حویلی کا بھی ہو گیا ہے۔'' بانو بولیں۔ پھر اپنے چھوٹے بھائی کا نام لیتے ہوئے بدر جہاں سے پوچھا:

''خالد نے بیعانے کی رقم لے لی؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ لی ہو گی تو پہلے تم کو بتائیں گے۔'' پھر بولیں: ''خریداروں نے کچھ شرطیں رکھی ہیں۔''

''کون سی شرطیں؟ ہم لوگوں نے تو منظوری دے دی ہے۔''

''نہیں، نیچے والے پوری طرح خالی کریں۔''

''تو کیا کہتے ہیں وہ لوگ۔''

''پیسے مانگ رہے ہیں خالی کرنے کے، اور بہت موٹی رقم۔''

''خالد سے کہو سامان پھنکوا دیں۔''

''نہیں اس میں پولیس تھانہ ہو سکتا ہے۔''

''ارے نوکر ہیں ہمارے۔ ہم نے رہنے کی جگہ دی تھی۔''

''ہاں لیکن رحیمن''، بدر جہاں نے اپنی پرانی نوکرانی کا نام لیتے ہوئے کہا، ''کے لڑکے اور داماد بہت شورہ پشت ہیں۔'' پھر کہا: ''اور وکیلوں سے ان کے تعلقات بھی ہیں۔'' بات بڑھے گی تو عدالت سے اپنے حق میں کچھ نہ کچھ کرا لیں گے۔''

''تو خالد سے کہو گھٹ بڑھ کر معاملہ طے کر لیں۔''

''وہی کرر ہے ہیں شاید۔''

''حویلی بک رہی ہے آپ کی؟''میں نے دونوں بہنوں کی باتیں سننے کے بعد پوچھا۔

''اتنی دیر سے اور کیا سن رہے ہو۔''بدر جہاں نے کہا۔

''آپ لوگ کہاں جائیں گے؟''

''خالد کہہ رہے تھے،''بدر جہاں نے بتایا۔''جب اسے توڑ کر دوبارہ بنایا جائے گا تو اسی میں ہمیں بھی رہنے کی جگہ دی جائے گی۔''

''ہر طرف سے گر رہی ہے۔''

''اسی لیے بیچا جا رہا ہے۔''بدر جہاں بولیں۔''مرمت کرانے میں بہت پیسہ لگے گا اور اتنا پیسہ ہے نہیں ہمارے پاس۔''

''بڑے والے ہال کی چھت...؟''میں نے پوچھا۔

''آدھی سے زیادہ گر چکی ہے۔''

''بہت عمدہ صوفے پڑے تھے اس میں۔''

''ہاں خالد نے بیچ دیے اونے پونے۔''

''اور وہ کھال پہنے ہوئے مصنوعی شیر؟ اس کی آنکھیں بالکل اصلی معلوم ہوتی تھیں۔''

''اُس کی کھال اور اُسکی آنکھوں والے شیشے رکھ لیے خالد نے۔''وہ بولیں۔

''لکڑی والا خول بیچ دیا کسی کے ہاتھ۔''پھر بولیں:''اتنا سب کچھ پوچھ رہے ہو تو خود دیکھ لو جا کر۔''

میں یہی چاہتا تھا۔ ان کے یہ کہتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کر سیدھا اس ہال میں پہنچا جہاں بچپن میں ماں کے ساتھ میں دیر تک بیٹھا رہتا تھا۔ ماں دونوں بہنوں سے باتیں کرتی رہتی اور میں اس شیر کو گھورتا رہتا جواب وہاں نہیں تھا۔ اس بہت بڑے ہال کی آدھی سے زیادہ گری ہوئی چھت کو دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ ہال کی بہت سی آرائشی چیزیں جن میں دیواروں پر آویزاں کسی اچھے مصور کے ذریعے بنائی ہوئی بدر جہاں کے بزرگوں کی بڑی بڑی رنگین تصویریں بھی تھیں، ایک کونے میں ڈال دی گئی تھیں۔ غالباً ان کا کوئی خریدار نہیں مل سکا تھا۔ ہال کے خوبصورت اور منقش

دروازوں کے پلّے بھی اکھاڑ کر ایک طرف رکھ دیے گئے تھے۔ان پلّوں کے بارے میں پوچھنے پر بدر جہاں نے بتایا کہ ان کا سودا ہو چکا ہے لیکن سودا کرنے والے نے انھیں ابھی تک اٹھایا نہیں ہے۔ہال کے بعد میں نے حویلی کے دوسرے حصوں کو بھی دیکھا۔سب بہت بوسیدہ حالت میں تھے اور تب میں نے سوچا اس حویلی میں وہی ایک چھت صحیح سلامت ہے جس کے نیچے دونوں بہنوں نے اپنا ٹھکانہ بنایا ہے۔بدر جہاں کے بھائی خالد پہلے تو حویلی کے ٹوٹے پھوٹے حصوں کو رہنے کے قابل بناتے رہے لیکن جب خرچ زیادہ ہونے لگا تو شہر کے نئے علاقے میں منتقل ہو گئے۔مگر حویلی کی فروخت کے سلسلے میں یہاں برابر آتے رہتے تھے۔

حویلی کو ہر طرف سے دیکھنے کے بعد میں وہیں آ گیا جہاں سے اٹھ کر گیا تھا۔

''دیکھ لیا اچھی طرح؟'' بدر جہاں نے پوچھا۔

''دیکھ لیا۔''

''کیا خیال ہے تمہارا، بیچ دینے کا فیصلہ ٹھیک ہے؟''

''مرمت میں واقعی بہت خرچ ہوگا۔'' میں نے کہا۔ پھر پوچھا:

''کون خرید رہا ہے؟''

''چوک کا ایک صرّاف۔ رادھے لال۔ بہت پیسے والا ہے۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بولیں:

''خالد چاہتے تھے اپنوں میں سے کسی کے ہاتھ بکے، لیکن اتنے دام دینے والا اپنوں میں کوئی ہے نہیں۔''

''ٹھیک ہے، جہاں اچھے پیسے ملیں وہیں سودا کیجیے۔''

''لوگ کہیں گے باپ دادا کی نشانی غیروں کے ہاتھ بیچ دی۔''

''لکھنؤ کی بہت سی جائدادیں اسی طرح غیروں کے ہاتھوں میں گئی ہیں، بلکہ وہ تو دام لگے بغیر ہی چلی گئیں۔آپ کو تو اچھے پیسے مل رہے ہیں۔''

''ہاں پیسے تو اچھے مل رہے ہیں، لیکن.....'' بدر جہاں نے ایک لمبی سانس کھینچی پھر کہا:

''اس کے نکل جانے کا دکھ بہت دن تک رہے گا۔'' اس کے بعد وہ خاموش

ہوگئیں۔ میں بھی کچھ نہیں بولا۔ ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہنا شروع کیا:

''بات یہ ہے..... میں آپ کے پاس ایک خاص کام سے آیا تھا۔''

''کس خاص کام سے؟''

''آپ ماں سے بہت قریب تھیں؟''

''تھی تو۔''

''وہ آپ سے اپنی بہت سی باتیں بتاتی تھیں؟''

''بتاتی تو تھیں۔''

''کبھی یہ بھی بتایا کہ وہ پیدا کب ہوئی تھیں! مطلب اپنی پیدائش کی تاریخ۔''

''اگر انھوں نے بتائی ہوگی تو میں نے کہیں لکھی ضرور ہوگی، ڈھونڈنا پڑے گی۔''
انھوں نے کہا۔ پھر کہا: ''جب سے حویلی کے بکنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے کپڑے لتّے، کاغذ پتّر سب کی پوٹلیاں بنا بنا کر رکھ دی ہیں۔ اب یاد نہیں کون سی چیز کس پوٹلی میں ہے۔'' یہ کہہ کر بولیں:

''کسی اور دن آؤ۔ ڈھونڈ کر رکھوں گی۔'' پھر بولیں: ''مگر اس کی ضرورت کیوں پڑی؟''

''ماں کی قبر پر کتبہ لگنا ہے، اسی پر لکھوانا ہے۔''

''مرنے کی تاریخ معلوم ہے؟''

''جی۔ وہ تو معلوم ہے۔ ہر وقت ذہن میں رہتی ہے۔''

''بٹیا...!'' میری بات ختم ہوئی تو بانو کی آواز آئی: ''تکیے ہٹا کر مجھے لٹا دو۔''

بدر جہاں نے جنھیں بانو بٹیا کہہ کر پکارتی تھیں تکیے ہٹا کر بانو کو لٹایا تو لیٹتے ہی انھوں نے پوچھا: ''یہ کس کے مرنے جینے کی باتیں ہو رہی ہیں؟''

''اِن کی ماں کی۔'' بدر جہاں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بڑی اچھی عورت تھی لیکن تکلیفیں بہت اٹھائیں۔'' بانو نے کہا۔ پھر بولیں:

''خالد میری دوا لائے؟''

''نہیں۔''

''کہا تھا اب کی ایک مہینے کی اکٹھا لے آئیں گے۔'' بانو بولیں۔ پھر پوچھا:

''کب ختم ہوئی تھی؟''

''تین دن پہلے۔''

''حکیم صاحب نے کہا تھا ناغا نہیں ہونا چاہیے۔اب تم جاؤ ان کے پاس۔'' یہ کہہ کر بانو نے بدر جہاں سے اپنے سرہانے رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی پوٹلی اٹھانے کے لیے کہا۔ بدر جہاں نے پوٹلی اٹھا کر انھیں دی تو وہ بولیں:

''اسے کھولو اور اس میں سے میرا بٹوہ نکال کر دوا کے پیسے لے لو۔''

''بیمار ہیں؟'' میں نے بانو کی طرف دیکھتے ہوئے بدر جہاں سے پوچھا۔

''دیکھ نہیں رہے ہو۔''

''دیکھ رہا ہوں اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔''

''کوئی خاص مرض نہیں ہے۔کمزوری ہے،اسی کی وجہ سے سانس پھولنے لگی ہے۔''

''یہ بھی تو کہیں پڑھاتی تھیں۔''

''ہاں۔نوکری ختم ہوئے پندرہ سال ہو گئے۔تم تو بہت زمانے بعد آئے ہو۔''

''کچھ لکھتی پڑھتی بھی تھیں۔''

''شاعری کا شوق تھا،شوق پورا ہوا تو بہت نام کمایا اس میں۔''

''کس کی باتیں ہو رہی ہیں؟'' بانو نے نحیف سی آواز میں پوچھا۔

''تمہاری،تمہاری شاعری کی۔''

''خالد نے میرا مجموعہ چھپنے کے لیے دیا؟''

''انھیں سے پوچھنا شام کو آئیں گے۔''

''کئی دن سے ٹال رہے ہیں،مر جاؤں گی تب چھپے گا۔''

''ان کے سر پر تو حویلی کا سودا سوار ہے،اس سے فرصت پائیں تو کچھ سوچیں۔''

''اِن سے پوچھو،یہ کچھ کر سکتے ہیں؟''

''کیا کہہ رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کتاب چھپوانا چاہتی ہیں اپنی شاعری کی۔تم کچھ کر سکتے ہو؟''

''نہیں، مجھے ان چیزوں کا کوئی تجربہ نہیں۔''

''بانو جب کچھ کہتی تھیں اور میرے ساتھ تمھارے گھر جاتی تھیں تو تمہاری ماں کو ضرور سناتی تھیں۔''

''جی انھیں بھی بہت شوق تھا شاعری کا۔''

''بانو اسی لیے تمہارے یہاں دیر دیر تک بیٹھتی تھیں، تمہاری ماں سنتی تھیں یہ سناتی تھیں۔'' بدر جہاں نے کہا۔ پھر کہا: ''اور وہ تمہارا بڑا والا بھائی وہیں کھڑا رہتا تھا۔ ایسے سنتا تھا جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہو۔''

''انھیں بھی شعر بہت یاد ہیں۔ ماں کے کتبے کے لیے انھوں نے ہی شعر لکھوائے ہیں اور وہی شعر لکھوائے ہیں جو ماں پڑھا کرتی تھیں۔''

''وہ تو شعر کے بغیر بات ہی نہیں کرتی تھیں۔'' یہ کہہ کر بدر جہاں کچھ دیر کے لیے رکیں اور اسی وقفے کا فائدہ اٹھا کر میں نے ان سے پوچھا:

''تو میں کب آؤں؟''

''آٹھ۔ دس دن بعد۔ میں دیکھتی ہوں ڈائریاں کس پوٹلی میں ہیں۔ انھیں میں سے کسی میں لکھی ہو گی۔''

●

کتبے کی عبارت والا پرچہ ماں کی پیدائش کی تاریخ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے نامکمل تھا۔ خواجہ کی حویلی سے نکل کر میں نے سوچا کہ پرچہ آغا صاحب کو دے کر ان سے بتا دوں کہ ماں کی پیدائش والا حصہ خالی چھوڑ کر باقی عبارت پتھر پر لکھنا شروع کر دیں تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔ بدر جہاں سے تاریخ معلوم ہو جانے کے بعد اس خالی حصے کو بھر کر پتھر ماں کی قبر پر لگوا دیا جائے گا۔ یہ سوچتے ہی میں آغا حسن خطاط کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے آغا صاحب سے علیک سلیک کے بعد پرچہ جیب سے نکالا اور ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''اس عبارت کا پتھر تیار ہونا ہے۔ سب کچھ نستعلیق میں لکھا جائے گا۔''

آغا صاحب نے پرچہ غور سے پڑھا پھر پوچھا:

''عبارت کس کی لکھی ہوئی ہے؟''

''بھائی کی۔ میرے بڑے بھائی کی۔ آپ تو جانتے ہیں انھیں۔''

''انھوں نے لکھی ہے؟''

''ہاں کیوں؟''

''کچھ نہیں۔ عبارت بہت عمدہ ہے ایسی اچھی عبارتیں کم آتی ہیں میرے پاس لکھنے کو۔'' آغا نے کہا پھر بولے: ''لیکن آج کل وہ ہیں کہاں؟''

میں خاموش رہا۔ پھر آغا خود ہی بولے:

''کوئی پندرہ دن پہلے نظر آئے تھے کہیں۔ کہاں نظر آئے تھے.........''

آغا یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر بولے: ''یاد آیا، سبطین آباد کے امام باڑے میں۔''

میں پھر خاموش رہا۔

آغا سمجھ گئے کہ میں اس موضوع پر کچھ نہیں کہنا چاہتا اس لیے بات وہیں ختم کر کے بولے: ''لکھ جائے گا۔ نستعلیق میں نا؟''

''جی نستعلیق میں۔''

''پتہ نہیں لوگ نسخ کیوں پسند کرتے ہیں۔ جو بات نستعلیق میں ہے وہ بھلا نسخ میں کہاں۔''

''بھائی بھی یہی کہہ رہے تھے۔''

''وہ خطاطی سے واقف ہیں۔''

''واقف ہیں تبھی تو کہہ رہے ہوں گے۔''

آغا کی نگاہ پرچے پر تھی۔ پرچہ دیکھتے دیکھتے بولے:

''لیکن ایک بات رہ گئی۔''

''وہ کیا؟''

''کیا جلی میں لکھا جائے گا اور کیا خفی میں؟''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کون سے حروف زیادہ نمایاں ہوں گے کون سے کم۔''

''یہ آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں لکھ لوں گا۔'' آغا نے کہا۔ پھر بولے: ''لیکن پیدائش کی تاریخ اور سنہ نہیں ہے۔''

''وہ بعد میں دے دوں گا۔ بتانا بھول گیا تھا۔ اس کی جگہ چھوڑ دیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ کب چاہیے ہے؟''

''جتنی جلد ہو سکے۔''

''پھر بھی پندرہ دن تو لگ ہی جائیں گے۔'' آغا نے کہا۔ ''پہلے میں لکھوں گا، پھر کھدائی ہوگی، پھر اسے پکی روشنائی سے بھرا جائے گا۔''

''پیدائش کی تاریخ بھی میں دس دن بعد ہی دے سکوں گا۔'' میں نے کہا۔ پھر پوچھا:

''لکھائی کا کتنا دینا ہوگا؟''

''وہ بعد میں دیکھ لیں گے۔'' آغا بولے۔ پھر کہا: ''آپ کو شاید معلوم نہیں آپ کے بھائی میرے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ بات گھر کی ہے۔''

''یہ بھائی نے بتایا نہیں۔''

''اور یہ بھی نہیں بتایا کہ میں آپ کی والدہ سے پڑھنے آتا تھا؟''

''نہیں۔ لیکن مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔''

''ہاں بہت چھوٹے تھے لیکن بسم اللہ ہو چکی تھی آپ کی اور استانی جی نے چھوٹے چھوٹے سورے بھی یاد کرا دیے تھے آپ کو۔'' یہ بتا کر مجھ سے پوچھا: ''اچھا یہ بتایئے بھائی کچھ ٹھیک ہوئے آپ کے۔'' پھر خود ہی بولے: ''ٹھیک نہیں ہوئے ورنہ میرے بارے میں یہ باتیں ضرور بتاتے۔'' پھر بتانے لگے: ''جب میرے ساتھ پڑھتے تھے اس وقت سے خلل تھا دماغ میں۔ پڑھتے پڑھتے کتابیں پھاڑ ڈالتے تھے۔ کبھی کبھی استانی جی پر بھی جھپٹ پڑتے تھے اور ان کے بال نوچنے لگتے تھے۔'' پھر بولے:

''ان باتوں کا برا نہ مانیے گا۔ آپ میرے چھوٹے ہیں دماغ کے ماہر کسی ڈاکٹر کو دکھایئے۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

پھر آغا اماں کی باتیں بتانے لگے:

''بہت اچھا پڑھاتی تھیں۔ سمجھا سمجھا کر۔ بات دماغ میں اتر جاتی تھی۔ بڑا افسوس ہوا ان کی موت کا اور آپ کے گھر کے نکل جانے کا بھی۔''

میں خاموش رہا۔

کچھ دیر بعد آغا نے مجھ سے کہا: ''ایک بات بتایئے جب استانی جی کا انتقال ہوا تھا، اس وقت کتبہ نہیں لکھوایا تھا۔''

''نہیں۔ کچی قبر پر ٹین کی ایک تختی لگوا دی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اب قبر کو پکا کرایا ہے۔ بھائی کی خواہش ہے کہ اس پر آپ سے لکھوا کر اچھا کتبہ لگوایا جائے۔''

●

میں نے طے کیا تھا کہ میں اس وقت تک بھائی کی طرف نہیں جاؤں گا جب تک لکھا ہوا پتھر ماں کی قبر پر لگ نہیں جائے گا۔ اب میں اس دن کا انتظار کر رہا تھا جس دن مجھے بدر جہاں نے ماں کی پیدائش کی تاریخ دینے کے لیے بلایا تھا اور اس دن کے آتے ہی میں خواجہ کی حویلی کی طرف چل دیا۔ لیکن جیسے ہی میں حویلی والی گلی کے منہ پر پہنچا، میں نے دیکھا کہ پوری گلی گرد سے بھری ہوئی ہے۔ میں منہ پر رومال رکھ کر گلی میں داخل ہوا تو بہت سے مزدور ہاتھوں میں کدالیں اور بیلچے لیے حویلی کی دیواروں کو توڑ رہے تھے۔ وہ حصہ جہاں ڈیوڑھی سے گزر کر میں نے بدر جہاں کو اپنے آنے کی اطلاع بھجوائی تھی، میدان بن چکا تھا لیکن اوپر کا حصہ ابھی نہیں توڑا گیا تھا۔ جب مزدوروں نے مجھے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے اپنے ہاتھ روکے تو ان میں سے ایک سے میں نے پوچھا:

''اوپر کوئی ہے؟''

''ایک بوڑھا ہیں۔'' مزدور نے جواب دیا۔

میں زینہ چڑھ کر اوپر پہنچا تو بدر جہاں کی رہائش والے حصے میں صرف ایک مسہری پڑی تھی۔ بدر جہاں اسی مسہری پر کچھ کھلی اور کچھ بندھی ہوئی پوٹلیوں کے درمیان بیٹھی تھیں۔

''آ سکتا ہوں۔'' میں نے بہت آہستہ سے اپنے آنے کی اطلاع دیتے ہوئے ان سے پوچھا۔

انھوں نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر پوٹلیوں کو ایک طرف کرتے ہوئے بولیں:

''آؤ آؤ۔'' پھر مجھے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا: ''تم کب آئے تھے؟''

''دس دن پہلے۔''

''تمہارے جانے کے تین دن بعد بانو کی طبیعت بگڑی اور جب تک ڈاکٹر آئے آئے اُن کی آنکھ بند ہوگئی۔'' پھر اپنے سرہانے سے بانو کی چھپی ہوئی کتاب اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے بولیں:

''یہ ان کے مرنے کے تین دن بعد چھپ کر آئی۔''

پھر مجھے ایک چھوٹا سا پرچہ دیتے ہوئے کہا: ''تاریخ ڈھونڈ لی میں نے۔ سنہ ۱۷ میں جون کی پندرہ کو پیدا ہوئی تھیں تمہاری ماں، ترپن سال کی عمر پائی انھوں نے۔''

پھر کتاب میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولیں: ''بانو چھتر کی ہو کے مریں، میں ستر کی ہو چکی ہوں۔''

میں خاموش بیٹھا رہا۔ بانو کی شکل میری آنکھوں میں گھوم رہی تھی اور میں انھیں اب بھی مسہری پر لیٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بدر جہاں بولیں:

''اچھا ہوا تم آ گئے۔ دو چار دن بعد میں یہاں سے جانے والی تھی۔ جب تک یہاں دوسری عمارت بن نہیں جاتی خالد کے یہاں رہوں گی۔'' پھر کہا:

''آج میں تمہاری کوئی خاطر نہیں کر سکتی، بہت پھیلاوا ہے، اسی کو سمیٹنے میں لگی ہوں۔''

''آپ نے اتنا بڑا کام کر دیا، یہی بہت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب پتھر مکمل ہو جائے گا۔'' پھر کہا: ''آپ مصروف ہیں۔ مجھے اجازت دیجیے۔'' یہ کہہ کر میں خواجہ کی برسوں پرانی حویلی سے جس کا بڑا حصہ توڑا جا چکا تھا، باہر نکل آیا۔

●

خواجہ کی حویلی سے نکل کر میں سیدھا آغا حسن خطاط کے پاس پہنچا اور انھیں وہ پرچہ

جو بدر جہاں نے مجھے دیا تھا، دیتے ہوئے کہا: ''یہ لیجیے، پتھر مکمل کر دیجیے۔''

''اسی کی جگہ رہ گئی تھی، باقی پتھر لکھا جا چکا ہے۔'' آغا بولے۔ ''پانچ دن بعد لے لیجیے گا۔''

پانچ دن بعد پتھر پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ آغا نے واقعی بہت عمدہ خط میں پوری عبارت لکھی تھی۔ بہت نپے تلے حروف اور ان کی بہت موزوں ترتیب۔

''بھائی پتھر دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔'' میں نے سوچا۔

آغا نے بھائی کا خیال رکھتے ہوئے پتھر کے جتنے پیسے بتائے میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں دے دیے اور دوسرے دن وہ پتھر ماں کی قبر پر لگوا دیا۔ پتھر لگوانے کے بعد میں بھائی کو اس کی اطلاع دینے امام باڑے پہنچا تو بھائی وہاں نہیں تھے۔ میں نے مسجد اور امام باڑے کے صحنوں، دالانوں اور چبوتروں پر گھوم گھوم کر بھائی کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ مجھے بار بار صحنوں اور دالانوں میں آتے جاتے دیکھ کر امام باڑے کے منتظم نے اپنے کمرے سے نکل کر مجھ سے پوچھا: ''کسے ڈھونڈ رہے ہیں، میر صاحب کو؟''

''میر صاحب؟''

''ارے جو مسجد میں نماز پڑھاتے تھے، انھیں کو؟''

''ہاں انھیں کو۔''

''وہ چلے گئے۔''

''لیکن وہ تو کہتے تھے جب تک امام باڑے کی مرمت پوری نہیں ہو جائے گی یہیں رہوں گا۔''

''ہاں جب تک رہے دن دن بھر مزدوروں کے ساتھ لگے رہے۔'' منتظم بولا۔ ''پھر کاریگر سے کسی بات پر خفا ہو گئے، اپنا سامان اٹھایا اور چلے گئے۔''

''یہ نہیں بتایا ہو گا کہاں جا رہے ہیں۔''

''نہیں یہ نہیں بتایا۔ چلے گئے ہوں گے کسی اور کربلا میں...... یا پھر کسی امام باڑے میں۔''

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''انھوں نے اپنے رہنے کے جتنے ٹھکانے بتائے.........''

''وہ امام باڑے اور کربلائیں تھیں۔''میں نے اس کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔''

''اچھا، آپ بتا سکتے ہیں کہ اور کن کن امام باڑوں اور کربلاؤں میں مرمت کا کام چل رہا ہے۔''

منتظم کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا:

''ابھی حال میں عباس باغ کی کربلا میں کچھ کام شروع ہوا ہے۔ برسوں سے ویران پڑی تھی۔''

منتظم کی یہ بات سن کر میں امام باڑے سے باہر چلا آیا۔

●

بھائی کے امام باڑے میں نہ ہونے سے ماں کی قبر پر لگے ہوئے پتھر کی خبر دینے کا جوش اب میرے اندر ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ لکھنؤ کی بیشتر کربلاؤں کی طرح عباس باغ کی کربلا بھی شہر کے بیرونی علاقے میں تھی۔ کچھ سال پہلے تک یہ علاقہ بھی ویران تھا لیکن اب دھیرے دھیرے آباد ہونے لگا تھا۔ شہر سے بہت دور ہونے کی وجہ سے میں نے اس کربلا کی طرف جانے کا خیال دل سے نکال دیا۔ لیکن اٹھتے بیٹھتے مجھے بھائی کا خیال ستاتا رہتا۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ پھر ایک روز مجھے اس نئی آبادی میں رہنے والے اپنے ایک ملاقاتی کی طرف سے اُس کے ایک عزیز کی مجلس کا رقعہ ملا۔ یہ مجلس آئندہ اتوار کو اسی کربلا میں ہونے والی تھی جہاں بھائی کے ہونے کا امکان تھا۔ یوں تو شاید میں اس مجلس میں نہ جاتا لیکن یہ سوچ کر کہ ممکن ہے وہاں بھائی سے ملاقات ہو ہی جائے میں نے اس مجلس میں شریک ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اگلی اتوار کے آتے ہی میں عباس باغ کی کربلا کی طرف چل پڑا۔ یہ کربلا لکھنؤ سے ہردوئی کی طرف جانے والی چوڑی شاہراہ کے بائیں جانب سرفراز گنج کے علاقے میں واقع تھی۔ لیکن لکھنؤ کی ہر کربلا اور امام باڑے کی طرح یہاں بھی چاروں طرف ناجائز قبضے تھے۔ کربلا انھیں ناجائز قبضوں کے درمیان چھپی ہوئی تھی اس لیے پہلی نگاہ میں آسانی سے نظر نہ آتی تھی۔ سرفراز گنج پہنچ کر مجھے بھی یہ پہلی نگاہ میں نظر نہیں آئی۔ لیکن دو۔ چار لوگوں سے پوچھنے کے بعد میں وہاں

پہنچ گیا۔ اندر پہنچ کر میں کربلا کی وسعت اور کشادگی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ باہر سے اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ کربلا اندر سے اتنی بڑی ہوگی۔ لکھنؤ کی عام کربلاؤں کی طرح یہاں بھی چاروں طرف صحنچیاں بنی ہوئی تھیں اور بیچ میں روضہ تھا۔ کربلا کی مرمت کا کام، جیسا کہ منتظم نے بتایا تھا، شروع ہو چکا تھا اور کچھ نئی تعمیر بھی ہوئی تھی جس میں روضے کے مقابل مجلسوں کے برپا ہونے کے لیے ایک ہال بنوایا گیا تھا۔ میرے ملاقاتی کے عزیز کی مجلس اسی ہال میں ہو رہی تھی لیکن میں ہال میں بیٹھنے کے بجائے باہر ہی کھڑا رہا۔ مجلس سننے میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ میری نگاہ چاروں طرف بنی ہوئی صحنچیوں میں بھائی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ مجلس کب ختم ہوئی اور کب سوگوار کربلا سے باہر چلے گئے، مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ میں اس وقت چونکا جب سوگواروں کے چلے جانے کے بعد میرے ملاقاتی نے مجلس کا تبرک دیتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

''یہیں رکنے کا ارادہ ہے؟''

''کچھ دیر رکوں گا۔ اس کربلا میں پہلی بار آیا ہوں، اسے اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔''

سوگواروں اور ملاقاتی کے چلے جانے کے بعد میں نے کربلا کو ٹھیک سے دیکھنا شروع کیا۔ کربلا کے صحن میں آموں اور کھجوروں کے بہت سے درخت تھے۔ ایک بار میں نے ماں سے پوچھا تھا کہ لکھنؤ کے روضوں اور کربلاؤں میں کھجوروں کے درخت کیوں لگائے جاتے ہیں۔ ماں نے بتایا تھا: ''انھیں دیکھ کر عراق اور شام کے ریگستانوں میں بنے ہوئے روضوں اور کربلاؤں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہاں کی ساری کربلائیں اور روضے انھیں کی نقل ہیں۔''

میں کربلا میں بنی ہوئی صحنچیوں کو گھوم گھوم کر دیکھنے لگا۔ دوسری کربلاؤں کی طرح یہاں بھی ہر صحنچی میں کوئی نہ کوئی آباد تھا۔ بعض رہنے والوں نے صحنچیوں کے آگے کی جگہ ٹین کی چادروں سے گھیر کر اُس میں رہائش کی اور گنجائش پیدا کر لی تھی۔ میں ان صحنچیوں کو دیکھتا ہوا رک رک کر آگے بڑھ رہا تھا کہ ٹین کی چادروں سے گھری ہوئی ایک صحنچی کے سامنے کھیلتے ہوئے ایک بچے نے مجھ سے پوچھا:

''کسے دیکھ رہے ہیں؟''

''کوئی بڑا ہے تمہارے گھر میں؟''

''ہاں۔ اپّی ہیں ہماری، بلائیں؟''

''بلاؤ۔''

''اپّی۔ اس بچے نے وہیں سے آواز لگائی۔ تمھیں کوئی بلا رہا ہے۔''

فوراً ہی ایک چوبیس پچیس برس کی لڑکی جس کا نصف چہرہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا سر پر ایک پھٹی ہوئی سیاہ چادر ڈالے ایک ہاتھ میں چکن کا کرتہ اور دوسرے میں سوئی تاگا لیے باہر نکلی۔

''کہیے۔'' اس نے کرتے کے اس مقام پر جہاں وہ چکن کی ایک خوبصورت بیل بنا رہی تھی سوئی کو پروتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں آس پاس کی صحنچیوں میں کوئی اور صاحب بھی رہنے کے لیے آئے ہیں، ابھی حال میں؟''

''آئے تو ہیں۔'' اس نے کہا۔ یہ سنتے ہی مجھے سکون ہوا۔ کچھ دیر ٹھہر کر وہ پھر بولی: ''برابر والی صحنچی میں رہتے ہیں، لیکن اس وقت کہیں نکلے ہوئے ہیں۔'' پھر پوچھا: ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

''بزازے سے، جہاں ناظم صاحب کا امام باڑہ ہے۔''

میری آواز صحنچی کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ امام باڑے کا نام سنتے ہی اندر سے ایک ادھیڑ عمر عورت کی آواز آئی: ''شامہ یہ امام باڑے سے کون آیا ہے؟''

''ایک صاحب، وہ جو نئے نئے آ کر رہے ہیں، انھیں پوچھ رہے ہیں۔'' اُس لڑکی نے کہا۔ یہ سنتے ہی ادھیڑ عمر عورت صحنچی سے باہر نکل کر ٹین کی چادروں کے بیچ لٹکے ہوئے ٹاٹ کے پردے کے پاس آ گئی اور پردے کو ذرا ہٹاتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

''آپ کو ان سے کیا کام ہے؟''

''کام کچھ نہیں ہے، ہماری طرف کے ہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر کہا: ''کسی نے بتایا ابھی حال میں یہاں آ کر رہے ہیں، اس لیے خیریت لینے چلا آیا۔''

''وہ تو صبح صبح نکل جاتے ہیں۔ دن میں کس وقت آئیں کوئی ٹھیک نہیں۔'' اس نے کہا۔

''کبھی کبھی دن دن بھر نہیں آتے۔'' پھر پوچھا: ''بزازے سے آئے ہیں؟''

''جی۔''

''ان کے رشتے دار ہیں۔''

''جی۔ رشتے دار ہی سمجھ لیجیے۔''

''تو ایک پیالی چائے پی کے جایئے۔'' ادھیڑ عمر عورت نے کہا۔ ''بھائی صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ جب سے آئے ہیں، ہم لوگوں میں گھل مل گئے ہیں۔ جب تک رہتے ہیں حسین اور محسن ان کے پاس سے ہٹتے نہیں۔'' اس نے اپنے دونوں بچوں کے نام لیتے ہوئے کہا جو میرے قریب ہی کھڑے مجھے گھورے جا رہے تھے۔ یہ کہنے کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو جو آنگن میں پڑی چارپائی پر بیٹھی کرتا کاڑھ رہی تھی آواز دی:

''شامہ کرسی لے کر آؤ اور جلدی سے چائے بناؤ۔''

لڑکی نے جلدی سے پلاسٹک کی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر سے کرتوں سے بھری ایک گٹھری ہٹا کر نیچے رکھی اور اسے لے کر باہر آ گئی پھر اپنے ڈوپٹے کو اپنے چہرے پر کستے ہوئے اس نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ میری آنکھیں اس سے چار ہوئیں اور معاً مجھے محسوس ہوا کہ میں سائرہ کو دیکھ رہا ہوں۔ میں اس کی لائی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر عورت ٹاٹ کے پردے سے لگی لگی بولی:

''بھائی صاحب کے سگوں میں کوئی ہے نہیں شاید۔''

''ہے لیکن وہ سگوں کے ساتھ رہتے نہیں۔''

''سگے رکھیں اپنے ساتھ تو کیوں نہ رہیں۔''

''نہیں وہ نہیں رہتے۔''

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے آپ ہی ان کے سگے ہوں۔''

''سگوں سے بڑھ کے ہوں، اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں لیکن نہیں رہتے۔''

اتنی دیر میں اس عورت کی بیٹی چائے لے کر آ گئی۔ اس نے سر پر اپنی چادر ٹھیک کرتے ہوئے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی اور ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور ایک بار پھر میں نے اس کی آنکھوں میں سائرہ کو دیکھا۔ ادھیڑ عمر عورت اندر صحنچی میں جا چکی تھی۔

''آپ نے بیکار چائے کی تکلیف کی۔'' میں نے اس لڑکی سے کہا۔
''اماں بھائی صاحب کو بہت مانتی ہیں، چائے پیے بغیر جانے نہیں دیتیں آپ کو۔''
''آپ لوگ یہاں کب سے رہ رہے ہیں؟'' میں نے نظریں جھکائے جھکائے اس سے پوچھا۔
''جنہیں ڈھونڈتے ہوئے آپ آئے ہیں، اُن کے آنے سے کوئی تین مہینے پہلے سے۔''
''پہلے کہاں رہتے تھے؟''
لڑکی چپ رہی۔
''پرانے لکھنؤ کی طرف کے ہیں؟''
''جی اُسی طرف کے ہیں۔''
''نخاس؟''
''نہیں اشرف آباد، وہیں ہمارا بہت بڑا مکان تھا۔''
''چھوڑ دیا۔''
''نہیں چھن گیا۔''
''چھن گیا؟''
''ہاں۔ ابا، جیسا اماں بتاتی ہیں۔ ٦٩ء کے فساد میں آٹھویں کے روز غلام حسین کے پُل پر قتل کر دیے گئے تھے۔'' اس نے کہا۔ ''نام سنا ہوگا آپ نے۔ اچھن مولائی کے نام سے مشہور تھے۔ آٹھویں کو انجمن کا علم لے کر نکلے تھے۔'' وہ بتا رہی تھی اور اندر شاید اس کی ماں سن رہی تھی۔
''ابا کے بارے میں کیا بتا رہی ہے۔'' یہ کہتی ہوئی شامہ کی ماں ٹاٹ کے پردے سے پھر آ لگی۔
''کیا بتا رہی ہے؟'' ماں نے پھر پوچھا۔ لڑکی چپ رہی۔
''بتا رہی تھیں کہ ٦٩ء کے جھگڑے میں.........''
''اس کے باپ مار دیے گئے۔ فسادیوں نے چاقوؤں سے گود گود کر مار ڈالا۔''
''اس میں تو بہت لوگ مارے گئے تھے۔ میرا ایک دوست یامین بھی اُسی میں مارا

گیا۔ منصور نگر کی چڑھائی پر۔''

''یاد ہے۔ کیسا کڑیل جوان تھا۔'' وہ بولیں۔

''ایسے بہت سے جوان ۴۷ء میں بھی........'' میں کہتے کہتے رکا۔

''مارے گئے۔ دونوں طرف کے مارے گئے۔''

''مجھے یاد ہے۔ اُن دنوں رات رات بھر نعرے لگتے تھے۔ کئی روز تک خون خرابہ ہوا۔''

''جھگڑا کیوں ہوا تھا؟'' پاس کھڑے ہوئے اس عورت کے بچوں میں سے ایک نے اُس سے پوچھا؟

''ہو گیا تھا۔''

''کیوں ہوا تھا؟''

''کچھ اور بڑے ہو جاؤ تو بتاؤں گی۔'' اس نے اُس بچے کو جھڑکتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بیٹی بتا رہی تھیں کہ آپ کا مکان چھن گیا۔''

''ہاں اس کے ابا کے مرنے کے بعد ہمارا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ جہاں ہم رہتے تھے وہاں دوسرے لوگوں کی آبادی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''ہر محرم یا ربیع الاول میں کچھ نہ کچھ ہو جاتا تھا اور جیسے ہی کچھ ہوتا ہم گھر چھوڑ دیتے۔ بس اسی میں ایک دن اُس پر دوسروں کا قبضہ ہو گیا۔'' وہ بولتی رہی: ''اب عدالت کچہری کے چکر میں کون پڑتا۔ صبر کر کے بیٹھ رہے۔ اب ہمیں جہاں جگہ مل جاتی ہے وہاں رہ پڑتے ہیں۔ پچھلے تین مہینے سے یہاں رہ رہے ہیں۔'' اتنا بتا کر اس نے شامہ کو آواز دی۔

''بیٹا! چائے کی پیالی اٹھا لو۔''

باہر آ کر شامہ چائے کی پیالی اٹھانے کے لیے جھکی تو اس کے چہرے پر بندھے ہوئے ڈوپٹے کی گرہ ڈھیلی ہو گئی اور اس کا پورا چہرہ کھل گیا۔ جتنی دیر میں اس نے ڈوپٹے کو چہرے پر دوبارہ باندھا، اتنی دیر میں میں نے اس کا پورا چہرہ دیکھ لیا۔ اس کا ناک نقشہ سائرہ سے بھی زیادہ تیکھا تھا۔ اگرچہ میں نے اسے ایک ہی لمحے کے لیے دیکھا تھا لیکن ایسے موزوں اور متناسب نقوش

میں نے اس سے پہلے کسی اور نسوانی چہرے پر نہیں دیکھے تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ تھا اور یہ رنگ اس کے رخساروں سے ابلا پڑتا تھا۔ شامہ کے چہرے کے خطوط اور اس کی ماں کے شائستہ لب و لہجے سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ لکھنؤ کا کوئی شریف اور مہذب گھرانہ ہے۔

شامہ چائے کی پیالی اٹھا کر اندر جانے لگی تو میں نے کہا:

''چائے بہت اچھی تھی۔''

''شکریہ۔ جن کے انتظار میں آپ بیٹھے ہیں وہ مجھی سے بنوا کر پیتے ہیں۔''

''وہ اچھی چائے کے بہت شوقین ہیں۔''

''اور اتفاق سے ہم اچھی چائے بنا لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ یہ کھنکتا ہوا قہقہہ بہت دیر تک میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ اور جب میں اس قہقہے کے اثر سے آزاد ہوا تو میں نے اس سے کہا: ''اپنی والدہ کو بلا دیجیے۔''

''اماں! وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''ذاکر ہے میرا نام۔'' میں نے کہا۔

شامہ کی ماں ٹاٹ کے پردے کے قریب آئیں تو میں نے ان سے کہا:

''چائے کا شکریہ۔ اب اجازت دیجیے۔'' پھر کہا:

''بھائی صاحب آئیں تو بتا دیجیے گا کہ ان کے محلے سے کوئی آیا تھا۔''

''بتا دوں گی لیکن آپ کا نام۔'' اور اس سے پہلے کہ میں اپنا نام بتاؤں شامہ بولی:

''ابھی بتایا ہے۔ ذاکر۔''

شامہ کے منہ سے یہ جملہ اور اس جملے میں اپنا نام سن کر مجھے اچھا لگا۔

''آپ چاہیں تو انتظار کر لیں۔ پلنگ پیڑ کے نیچے ڈلوائے دیتے ہیں۔'' شامہ کی ماں نے کہا۔ پھر بڑی محبت سے بولیں: ''دن کا کھانا یہیں کھا لیجیے گا جو دال روٹی ہے وہ حاضر ہے۔''

''نہیں۔ آپ بتا رہی تھیں ان کے آنے کا کوئی ٹھیک نہیں۔''

''جی یہ تو ہے۔''

''تو پھر کسی اور دن آؤں گا۔ آج کچھ اور کام ہیں۔''

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا لیکن وہاں سے ہٹنے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں چلنے لگا تو دیکھا کہ شامہ ٹاٹ کے پردے سے لگی کھڑی ہے۔ کربلا سے باہر نکلتے نکلتے میں نے دو۔ تین بار پیچھے مڑ کر دیکھا اور شامہ کو اسی ٹاٹ کے پردے کے قریب کھڑا پایا۔

میں کربلا سے باہر نکل کر آ تو گیا لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرف جاؤں۔ بھائی مجھے کربلا میں نہیں ملے تھے لیکن مجھے ان کے نہ ملنے کا دکھ زیادہ اس لیے نہیں تھا کہ میں نے یہاں اسے دیکھ لیا تھا جس نے مجھے ماں کے مکتب کے ان دنوں کی یاد دلا دی تھی جب میں سائرہ کے ساتھ بیٹھ کر ماں سے سبق لیا کرتا تھا۔ سائرہ کی یاد نے مجھے کچھ دیر کے لیے افسردہ کر دیا لیکن پھر شامہ کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومنے لگا اور پھر میں گھر کی طرف آتے وقت یہ نہیں طے کر پایا کہ میں اپنی آنکھوں میں سائرہ کو دیکھ رہا ہوں یا شامہ کو۔

گھر آ کر میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب اور کس دن کربلا کی طرف جایا جائے اور کس وقت جایا جائے کہ بھائی مل جائیں۔ شامہ اور اس کی ماں سے جب انھیں میرے آنے کے بارے میں معلوم ہوگا تو وہ سمجھ تو جائیں گے کہ میں ہی آیا تھا۔ اس لیے کہ شامہ کو میں نے اپنا نام بتا دیا تھا۔ میں نام نہ بھی بتاتا تب بھی بھائی میری شکل وشباہت کے بیان سے سمجھ لیتے کہ میں ہی آیا تھا اور شکل وشباہت نہ بھی بتائی جاتی اور صرف یہ بتایا جاتا کہ انھیں کوئی پوچھنے آیا تھا تب بھی وہ یہی سمجھتے کہ میں ہی آیا ہوں گا۔ کیونکہ اور کوئی نہ تو ان کی تلاش میں نکلتا ہے، نہ اُن کے لیے اتنا پریشان رہتا ہے۔

''اتوار ہی کا دن مناسب رہے گا۔'' سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا۔

اور پھر میں آئندہ اتوار کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اتوار آنے سے ایک دن قبل میں نے سوچا کہ کربلا خالی ہاتھ جانا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے میں نے شامہ کے بھائیوں کے لیے ٹافیاں اور اس کی ماں کے لیے کچھ پھل خرید کر رکھ لیے اور دوسرے دن میں منہ اندھیرے گھر سے نکل پڑا اور صبح ہونے سے پہلے کربلا پہنچ گیا۔

کربلا میں کوئی چہل پہل نہیں تھی۔ صحنچیوں میں رہنے والے ابھی سوئے ہوئے تھے۔ میں شامہ والی صحنچی کے پاس پہنچ کر یہ دیکھنے کے لیے رک گیا کہ وہاں کوئی جاگ رہا ہے یا نہیں۔

لیکن کسی طرح کی آہٹ نہ پا کر میں سمجھ گیا کہ وہاں بھی سب سوئے ہوئے ہیں۔ اب میں اس صحنچی کی طرف بڑھا جہاں بھائی رہ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بھائی وہاں اپنی مخصوص چٹائی پر جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی، بیٹھے تلاوت کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا:

''آؤ آؤ مجھے معلوم تھا کہ تم یہاں بھی پہنچ جاؤ گے۔''

بھائی جس صفحے کی تلاوت کر رہے تھے وہاں نشانی لگا کر انھوں نے قرآن بند کیا اور رحل کو ایک طاق پر رکھ کر مجھ سے بولے:

''تمہارے آنے کی خبر مل گئی تھی، شامہ نے مجھے بتایا کہ تم کس طرح میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔''

''کس طرح پوچھ رہا تھا؟''

''خود کو میرا بھائی بتائے بغیر میری خیریت معلوم کر رہے تھے، ہم محلّہ بن کر۔''

''اصل میں.......''

''بھائی بتانے میں تمہیں ڈر تھا کہ شاید میں تم سے نہ ملوں اور یہ کربلا چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں۔'' میری بات کاٹتے ہوئے انھوں نے کہا۔ پھر بولے:

''اب یہاں سے اور کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''کیوں؟''

''ایک تو صحت اجازت نہیں دیتی۔'' وہ بولے۔ پھر کہا: ''دوسرے شامہ اور اس کی ماں بہت خیال رکھتی ہیں۔ کسی طرح کی تکلیف نہیں ہے یہاں۔'' یہ کہنے کے بعد پوچھا:

''تمہاری طرف سب خیریت ہے۔''

''ابھی تو ہے۔''

''مطلب؟''

''لوگ ماحول خراب کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔''

''وہ تو کرتے رہیں گے۔'' انھوں نے کہا پھر پوچھا:

''منجھلے کیسے ہیں؟''

''گیا نہیں ان کی طرف کئی دن سے، ماں کے فاتحے کے دن جاؤں گا۔''

ماں کا ذکر آتے ہی بھائی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ انھوں نے فوراً پوچھا:

''اور وہ ماں کا پتھر؟''

''یہی بتانے آیا تھا اور یہی بتانے سبطین آباد کے امام باڑے گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''آپ جس جگہ کو چھوڑتے ہیں وہاں یہ نہیں بتاتے کہ یہاں سے کہاں جا رہے ہیں۔''

''اگر مجھے خود یقین ہو کہ کہاں جا رہا ہوں تو بتاؤں۔'' انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر بولے:

''بس نکل پڑتا ہوں اور یہ راستے میں طے کرتا ہوں کہ اب کہاں جاؤں گا۔''

''پتھر لگوا دیا ہے ماں کی قبر پر۔'' میں نے کہا۔ ''آغا صاحب نے کمال کا پتھر لکھا ہے۔ ماں ضرور خوش ہوگی۔''

بھائی یہ سن کر خوش ہوئے اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی خوشی کا اظہار کرتے، برابر والی صحنچی سے آواز آئی:

''بھائی جان! چائے لا رہے ہیں۔''

''دو پیالی۔'' بھائی نے اونچی آواز میں کہا۔

اور فوراً ہی شامہ ایک پرانی سی کشتی میں چائے کی دو پیالیاں لیے ہوئے داخل ہوئی اور مجھے دیکھتے ہی ٹھٹھک گئی۔

''بھائی ہے میرا، چھوٹا بھائی۔'' بھائی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے شامہ سے کہا۔

''پچھلی اتوار کو یہی آئے تھے۔'' شامہ نے ڈوپٹے سے اپنے آدھے چہرے کو ڈھانپتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے کی خوشی بھائی نے محسوس کر لی تھی۔ ہم دونوں کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ بولے:

''پیچھے پڑا رہتا ہے میرے۔ جہاں رہنے کے لیے پہنچتا ہوں، وہاں پہنچ جاتا ہے۔ ضد ہے کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔''

''تو کیا آپ چلے جائیں گے؟''

''نہیں، یہاں سے اب کہیں نہیں جاؤں گا۔''
یہ سن کر شامہ کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر آئی۔
''چائے پی لیجیے۔ ناشتہ بنا کے لاتی ہوں۔'' شامہ یہ کہتی ہوئی صحنچی سے باہر نکل گئی۔
اس کے باہر جاتے ہی بھائی بولے: ''بہت اچھی لڑکی ہے۔ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔''
''ہاں۔ پچھلی بار آیا تھا تو چائے پیے بغیر نہیں جانے دیا۔''
''باپ نہیں ہیں۔ ۶۹ء کے جھگڑے میں مار دیے گئے۔''
''ان کی ماں بتا رہی تھیں۔''
''اچھے خاندان کے ہیں۔ بات چیت طور طریقے سب شریفوں کے ہیں۔''
''جی۔ ایک بات پوچھوں۔'' میں نے کہا۔
''پوچھو۔''
''آپ کو سائرہ یاد ہے۔''
''وہی جو ماں کے مکتب میں پڑھنے آتی تھی؟''
''وہی، وہی۔''
''عین جوانی میں انتقال ہوا تھا اس کا، شادی کے فوراً بعد۔''
''جی۔'' میں نے کہا۔ پھر پوچھا: ''آپ کو اس لڑکی میں سائرہ کی صورت نظر نہیں آتی۔''
یہ سن کر بھائی نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کیں جیسے وہ سائرہ کے چہرے کو اچھی طرح سے یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر بولے: ''مشابہت تو ہے۔ اچھی خاصی۔''
اتنی دیر میں شامہ ناشتہ لے کر آ گئی۔ بہت عمدہ سکی ہوئی روغنی روٹیاں اور بھنڈی کی سبزی۔ جب سینی ہمارے سامنے رکھ کر وہ صحنچی سے باہر جانے لگی تو میں نے اسے آواز دی:
''سنیے!!''
''جی۔''
میں نے اپنے بڑے تھیلے میں سے پھلوں کا تھیلا نکال کر کہا: ''یہ آپ کی والدہ کے لیے ہیں۔'' پھر ٹافیوں سے بھرا لفافہ نکالتے ہوئے کہا: ''اور یہ آپ کے دونوں بھائیوں کے لیے۔''

شامہ نے دونوں چیزیں لینے کے بعد میرے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا جیسے اسے انتظار ہو کہ میں تھیلے سے کچھ اور نکالنے والا ہوں۔ لیکن تھیلے میں کچھ اور نہیں تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ تھیلے میں کچھ اور نہیں ہے تو وہ دونوں چیزیں لے کر اپنی صحنچی کی طرف چلی گئی لیکن پھر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گئی۔

''بھائی جان! اماں نے کہا ہے کہ یہ کھانا آج یہیں کھائیں گے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولی: ''اماں آپ کو دعا کہہ رہی ہیں۔ پھلوں اور ٹافیوں کا شکریہ۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر بھائی سے پوچھا:

''کیا کھائیں گے؟''

''جو پک جائے گا۔''

''اِن سے پوچھ لیجیے، ان کی پسند کی کوئی چیز۔''

''نہیں، جو پکے گا وہی کھا لوں گا۔'' میں نے کہا۔

اس کے بعد شامہ چلی گئی اور دوپہر تک نہیں آئی۔ اس کے جانے کے بعد بھائی نے پھر اُن لوگوں کے بارے میں بات شروع کی:

''میری طرح یہ لوگ بھی ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ اس سے پہلے امداد حسین خاں کی کربلا میں تھے، وہاں کے متولی نے بسا تو دیا لیکن پھر پیسے مانگنا شروع کر دیے، چھوڑ کر یہاں چلے آئے۔''

''آپ کو بہت مانتے ہیں یہ لوگ۔''

''میں بھی ان کا بہت خیال رکھتا ہوں۔'' انھوں نے کہا۔ ''بڑی پریشانی میں ہیں۔''

''ماں بیٹی دونوں کرتے کاڑھتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں اور دونوں بچے زردوزی کے کام پر بٹھا دیے ہیں۔'' بھائی بولے: ''شامہ کی ماں نواب زادی ہیں لیکن حالات شوہر کی موجودگی ہی میں خراب ہونا شروع ہو گئے تھے۔''

''شامہ کچھ پڑھی لکھی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آٹھواں پاس کر لیا ہے۔ اس کے بعد پڑھائی چھوڑ دی۔'' یہ کہنے کے بعد بھائی

بولے: ''ماں بھی دن میں بچوں کو پڑھاتی اور رات کو لالٹین کی مدھم روشنی میں سلائی کڑھائی کیا کرتی تھی۔ اس کے انگوٹھوں اور انگلیوں میں جگہ جگہ نشان تھے سوئی چبھنے کے۔''

''جی میں نے بھی دیکھے تھے۔''

''فاطمہ بھی ماں کی طرح محنت کرتی ہیں۔'' انھوں نے شامہ کی ماں کا نام لیتے ہوئے کہا۔ پھر بولے: ''اور شامہ ان کے ساتھ برابر سے لگی رہتی ہے۔'' پھر بات بدلتے ہوئے بولے:

''تو پتھر لگ گیا ماں کی قبر پر۔''

''جی۔ اب ان کی قبر دور سے پہچانی جا سکتی ہے۔''

''جاؤں گا، کل پرسوں میں جاؤں گا اس طرف۔'' یہ کہہ کر بولے: ''سب کچھ اسی طرح لکھا ہے جیسے میں نے لکھوایا تھا؟''

''بالکل اُسی طرح۔''

''ماں کا فاتحہ کب ہے؟''

''اسی مہینے کی تیسری جمعرات کو۔''

''وہاں بھی جاؤں گا۔''

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دوسری صحنچی کی طرف سے شامہ کی آواز آئی:

''بھائی جان! چائے تو نہیں پئیں گے؟'' بھائی نے میری طرف دیکھا۔

''پی لوں گا۔ یہاں اچھی چائے بنتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے آتے ہی سب سے پہلے شامہ کو دم کی چائے بنانا سکھائی۔ ایک بڑی کیتلی اور ٹکوزی بھی لا کر دی۔ اب وہ بہت اچھی چائے بناتی ہے۔'' یہ کہہ کر بھائی نے شامہ کی صحنچی کی طرف مونہہ کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا: ''بنالو۔''

کچھ دیر بعد شامہ چائے لے آئی اور جیسے ہی اس نے چائے کی کشتی ہمارے سامنے رکھی بھائی بولے:

''ارے بھئی اس سے بھی پردے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھائی ہے میرا۔''

میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ شامہ بھائی کے کہنے سے اپنا چہرہ کھولتی ہے یا نہیں اس کی

طرف دیکھا۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے آنکھیں ملتے ہی اس نے اپنی آنکھیں جھکالیں اور اپنا چہرہ کھولے بغیر واپس چلی گئی۔

دوپہر گزر چکی تھی۔ میں بھائی سے ادھر ادھر کی باتیں کرر ہا تھا، اچانک شامہ کی آواز آئی: ''بھائی جان! ہاتھ دھو لیجیے۔ کھانا لا رہے ہیں۔''

تھوڑی ہی دیر بعد شامہ ایک بڑی سینی میں کھانا لے کر آ گئی اور سینی رکھتے ہوئے بھائی سے بولی: ''آپ کو مونگ گوشت بہت پسند ہے، وہی پکایا ہے۔ بیگن کا بھرتا اور چاول بھی ہیں۔'' پھر بولی: ''اچھی طرح سے کھایئے گا، جی لگا کر۔'' یہ کہہ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''بڑی محنت سے پکایا ہے۔''

سینی میں سب چیزیں الگ الگ پیالوں میں رکھی تھیں اور ایک کنارے تہ کی ہوئی گرم چپاتیاں اور بیچ میں چینی کی ایک طشتری میں نمک لگی ہوئی کھیرے اور ککڑی کی پھانکیں۔

سینی رکھ کر شامہ جانے لگی تو بھائی بولے:

''تم نے میری پسند کی ہانڈی پکائی ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔''

شامہ چلی گئی تو بھائی نے کھانا شروع کیا۔ مونگ گوشت کے ایک دو لقمے مونہہ میں رکھنے کے بعد انھوں نے کہا: ''یہ بتانا مشکل ہے کہ فرزانہ اچھا پکاتی ہے یا شامہ۔''

''دونوں کے ہاتھ میں ایک سا مزہ ہے۔'' میں نے کہا۔

ہم شامہ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا مزے لے لے کر کھا رہے تھے کہ اُس کی آواز آئی:

''کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں۔''

''نہیں، سب کچھ ضرورت سے زیادہ ہے۔'' بھائی نے اُسے بتایا۔

کھانا کھانے کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں ایک نیند لینا چاہتا تھا لیکن بھائی کے پاس ایک ہی چٹائی تھی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں، اسی وقت شامہ سینی لینے چلی آئی۔ مجھے جھپکیاں لیتے دیکھ کر اس نے وہیں سے اپنی ماں کو آواز دی:

''اماں! پیڑ کے نیچے پلنگ ڈلوا دیجیے۔'' پھر مجھ سے بولی: ''کچھ دیر لیٹ جایئے آپ کو نیند آ رہی ہے۔'' پھر پوچھا: ''کھانا اچھا لگا آپ کو؟''

''بہت۔''

اتنی دیر میں پیڑ کے نیچے پلنگ بچھ چکا تھا جس پر ایک دری اور اس دری پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی اور پلنگ کے سرہانے رکھے ہوئے تکیے پر ایک بہت خوبصورت کڑھا ہوا غلاف چڑھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی کڑھائی شامہ کے ہاتھ کا کمال ہے۔ ہوا بہت اچھی چل رہی تھی۔ لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ مغرب کی اذان سے کچھ پہلے میں گہری نیند سے جاگا تو کچھ دیر کے لیے سمجھ ہی نہ سکا کہ میں کہاں ہوں اور یہ کون سا وقت ہے۔ میں نے صحنچی کے باہر شامہ کو کھڑے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ میں کربلا میں ہوں اور سہ پہر کی نیند سے جاگا ہوں۔

''چائے لا رہی ہوں۔'' شامہ نے پلنگ کے قریب آ کر کہا۔ اب وہ مجھ سے براہِ راست مخاطب ہونے لگی تھی مگر میں بھائی کے سامنے اس سے بہت کھُل کر بات کرتے ہوئے کترا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے لیے چائے لے آئی۔ جتنی دیر تک میں چائے پیتا رہا وہ باہر بندھی ہوئی الگنی پر سے سوکھ جانے والے کپڑے اتارتی رہی۔ جب بھی وہ الگنی پر سے کپڑا اتارنے کے لیے اپنا ایک یا دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتی میری نگاہ اس کے جسم کے چھپے ہوئے حصوں پر جا پڑتی۔ میں چائے ختم کر چکا تو وہ میرے پاس آئی اور چائے کی پیالی کو میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا:

''اچھی بنی ہے؟''

''بہت۔''

''اور لاؤں؟''

''نہیں۔ صرف صبح کو زیادہ پیتا ہوں۔''

وہ چائے کی پیالی لے کر جانے لگی تو میں نے اسے روکتے ہوئے کہا:

''سنیے! آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

''کہیے۔''

''بھائی یہاں سے کسی اور جگہ جائیں تو انھیں جانے نہ دیجیے گا۔'' میں نے کہا۔

''بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ یہاں آپ لوگ دیکھ بھال کر لیتے ہیں۔''

''میرے روکنے سے رک جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''رک جائیں گے۔ آپ کو بہت مانتے ہیں۔'' یہ سن کر وہ چپ رہی۔

''ایک اور بات کہنا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''یہ کچھ پیسے ہیں، رکھ لیجیے، جب اُنھیں ضرورت ہو دے دیجیے گا۔'' میں نے ہزار روپے جو میں بھائی کے لیے لے کر گیا تھا اسے دیتے ہوئے کہا۔ پھر کہا: ''اُن کا ہاتھ بہت کھلا ہوا ہے، انھیں دیتا ہوں تو ایک ہی بار میں خرچ کر دیتے ہیں۔''

''انھیں برا نہیں لگے گا۔'' اس نے کہا۔

''نہیں میں انھیں سمجھا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

شامہ کو روپے دے کر میں بھائی سے ملنے کے لیے صحنچی میں گیا تو وہ مغرب کی نماز کے لیے مسجد جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

''سو لیے ٹھیک سے۔'' مجھے دیکھتے ہی انھوں نے پوچھا۔

''سو لیا۔''

''چائے پی؟''

''پی لی۔ اٹھتے ہی شامہ نے دے دی تھی۔'' میں نے کہا۔ پھر ان سے اجازت لیتے ہوئے کہا: ''اب چلتا ہوں۔'' آپ کے لیے کچھ پیسے شامہ کے پاس رکھوا دیے ہیں۔ جب ضرورت ہو تو لے لیجیے گا۔''

''اسے کیوں دیے؟'' بھائی ذرا غصے سے بولے۔

''بہت سگھڑ معلوم ہوتی ہے۔ آپ کی ضرورت کے حساب سے خرچ کرے گی۔''

یہ سن کر بھائی مسکرائے۔ پھر کہا: ''سگھڑ تو بہت ہے۔ ماں ہوتی تو یہ اس کے دل میں اتر جاتی۔''

میں چپ رہا۔ بھائی مسجد کے لیے نکلے تو میں ان کے ساتھ ہی نکل آیا اور جب کربلا کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو بھائی بولے:

''شامہ سے بتا کر نہیں جاؤ گے۔'' اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا انھوں نے شامہ کو آواز دیتے ہوئے کہا: ''شامہ یہ جا رہا ہے۔''

فوراً ہی شامہ اپنی صحنچی سے نکل کر ٹاٹ کے پردے کے پاس آ گئی۔ ایک لمحے کے لیے رکی پھر پوچھا: ''اب کب آئیں گے؟''

''اتوار اتوار آیا کروں گا۔ یہ جگہ، جہاں میں رہتا ہوں وہاں سے بہت دور ہے۔ روز نہیں آ سکتا۔'' پھر شامہ کی طرف دیکھتے ہوئے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں بتا دیا کہ بھائی کا خیال رکھنا اور اس کے بعد میں کربلا سے باہر نکل آیا۔

●

میں شامہ سے اتوار اتوار آنے کے لیے کہہ کر آیا تھا لیکن دو اتواریں گزر گئیں اور میں کربلا نہیں جا سکا۔ لکھنؤ کی اتواریں مجلسوں میں نکل جاتی ہیں۔ شاید ہی کوئی اتوار ہو جس کے لیے آپ کو اپنے کسی عزیز یا ملاقاتی کی مجلس کا رقعہ نہ ملے۔ پچھلی دونوں اتواریں مجلسوں میں گزریں لیکن یہ تیسرا اتوار خالی تھا۔ میں نے ہفتے کی شام کو پکا ارادہ کر لیا تھا کہ صبح نمودار ہونے سے پہلے بھائی کے ٹھکانے کی طرف نکل جاؤں گا۔ ایسا سوچتے وقت مجھے شامہ کا بھی خیال آیا۔ پچھلی بار میں اس کے لیے کچھ نہیں لے کر گیا تھا لیکن اس بار ضرور کچھ لے جانا چاہتا تھا۔

کیا لے جاؤں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے تین چیزیں خریدیں: خوبصورت کڑھے ہوئے رومال؛ الگ الگ رنگ کے دھاگوں کی پھرکیاں اور مختلف ناپوں کی سوئیوں کے پتے اور سر پر ڈالنے والی ایک خوش رنگ چادر۔ شامہ کے بھائیوں اور اس کی ماں کے لیے تھوڑی سی مٹھائی بھی خرید لی۔ یہ سب چیزیں لے کر پچھلی بار کی طرح میں صبح صبح کربلا پہنچ گیا۔ لیکن بھائی کی طرف گیا تو وہ اپنی صحنچی میں نہیں ملے۔ اور اس سے پہلے کہ میں ان کے بارے میں کچھ سوچتا برابر والی صحنچی سے آواز آئی:

''بیٹھ جائیے۔ دس بجے تک آئیں گے۔ اپنی ماں کی قبر پر گئے ہیں۔''

یہ شامہ کی آواز تھی۔ میں صحنچی میں گیا تو اس کی آرائش دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ چیزیں جو تھیں تو بھائی کی ضرورت کی، لیکن جنہیں میں نے بھائی کی صحنچی میں پہلے نہیں دیکھا تھا، بہت

قرینے سے مناسب جگہوں پر رکھی ہوئی تھیں اور فرش پر ایک کے بجائے دو چٹائیاں بچھی تھیں۔
دیوار پر ایک خوبصورت آئینہ آویزاں تھا۔ ایک کونے میں ایک اسٹول پر ایک خوبصورت کڑھا ہوا کپڑا بچھا تھا جس پر ایک طرف ہلکے گلابی رنگ کا ایک تولیہ تہہ کیا ہوا رکھا تھا اور اسی کے پہلو میں پلاسٹک کی ایک صابن دانی اور اسی کے برابر ایک کنگھا۔ صحنچی کے طاقوں پر معمولی لیکن عمدہ بیل بوٹے والے چھوٹے ریشمی پردے پڑے تھے۔ اور صحنچی کے دوسرے کونے میں ایک دوسرے اسٹول پر ایک بہت خوبصورت چائے کی کشتی میں ایک اچھی سی چینی کی کیتلی رکھی تھی اور اسی کے پاس چائے کی دو خوش نما پیالیاں۔

میں یہ سب کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ شامہ چائے لے کر آ گئی۔

''اتنی جلدی۔'' میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''پچھلی دونوں اتواروں کو نماز کے وقت اٹھ کر میں نے چائے بنالی تھی لیکن آپ نہیں آئے۔'' اس نے کہا۔ ''اور بھائی جان نے بھی نہیں بتایا کہ کیوں نہیں آئے۔'' پھر بولی: ''آج بھی میں نے نماز کے لیے اٹھتے ہی چائے دم دے لی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''ختم ہو جائے تو دوسری لے لیجیے گا۔''

میرے طلب کیے بغیر جب شامہ چائے کی دوسری پیالی لے کر آئی تو میں نے اس سے کہا:

''آپ نے تو صحنچی کی صورت ہی بدل دی۔''

''جب ہمارا مکان تھا تو ہم ہر وقت صفائی اور سجاوٹ میں لگے رہتے تھے۔'' اس نے کہا۔ پھر بولی: ''آپ جو پیسے دے کر گئے تھے، یہ چیزیں انھیں سے خریدی ہیں۔ آپ کے دیے ہوئے روپیوں میں سے کچھ بھائی جان نے لیے ہیں، باقی ہیں میرے پاس۔''

''رکھے رہیے۔'' میں نے کہا۔ پھر اس کے لیے لائی ہوئی چیزیں اسے دیتے ہوئے کہا:

''پچھلی بار آپ کے لیے کچھ نہیں لایا تھا۔ اس بار ڈرتے ڈرتے یہ چیزیں لایا ہوں۔ لینے سے انکار نہ کیجیے گا۔''

میری لائی ہوئی چیزوں کو لیتے وقت شامہ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ اس نے انھیں

شوق سے دیکھا پھر بولی: ''اچھی ہیں۔لیکن یہ پھرکیاں اور سوئی کے پتے ؟''
''آپ لوگ کام بنانے کے لیے ایک ایک دو۔دو خرید کر لاتے ہیں، میں اکٹھا لے آیا۔ اب دو۔چار مہینوں کی چھٹی۔''میں نے کہا۔پھر کہا: ''اور اکٹھا خریدنے سے سستی بھی ملتی ہیں۔''
''لیکن آپ کیوں لائے اتنی چیزیں؟''اس نے پوچھا۔
میں لمحہ بھر کے لیے چپ رہا پھر اس کی ماں اور بھائیوں کے لیے لائی ہوئی مٹھائی اسے دیتے ہوئے بولا: ''خالہ کو برا تو نہیں لگے گا۔''
''ایسا کیجیے....'' وہ بولی: ''آپ یہ چیزیں اپنے ہاتھ سے انھیں دے دیجیے لیکن یہ نہیں بتایئے گا کہ کون سی چیز کس کے لیے ہے۔بس کہیے گا آپ سب کے لیے ہے۔''
میں نے وہی کیا جو شامہ نے کہا تھا۔لیکن جب شامہ میرے لیے ناشتہ لے کر آئی تو اس کے سر پر وہی چادر تھی جو میں لے کر آیا تھا۔
دس بجتے بجتے بھائی آ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے: ''پچھلی دو اتواروں میں کہاں غائب تھے۔''
''مجلسیں۔آپ تو جانتے ہیں، لکھنؤ کی اتواروں پر مُردوں کا قبضہ ہے۔''
یہ سن کر بھائی نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔پھر بولے: ''ناشتہ تو کر ہی لیا ہوگا۔''
''جی۔پڑوس والے........''
''ہاں۔شامہ نے پچھلی دو اتواروں کو بھی ناشتہ بنا کر رکھا لیکن تم آئے نہیں۔'' یہ کہہ کر بولے: ''ماں کی قبر پر سے آ رہا ہوں۔بھئی بہت عمدہ کتبہ ہے۔طبیعت خوش ہوگئی۔میری طرف سے آغا صاحب کا شکریہ ادا کر دینا۔'' پھر کہا: ''میں صبح کی اذان ہوتے ہی نکل گیا تھا۔ گورکن مجھے وہاں صبح صبح دیکھ کر حیران رہ گیا۔قبر بہت اچھی بنی ہے۔ماں کے دل سے تمہارے لیے دعائیں نکل رہی ہوں گی۔''
''لیکن یہ سب ہوا آپ کی وجہ سے۔''میں نے کہا۔
بھائی یہ سن کر چپ رہے۔میں نے ان کی خاموشی توڑتے ہوئے کہا:
''آپ کہیں تو کل پرسوں آ کر میں آپ کو حکیم صاحب کے پاس لے چلوں۔''

''کیوں؟''

''دکھانے، گردوں کے معاملے میں بے پروائی مت کیجئے۔ کئی بار کہہ چکا ہوں۔''
میں نے کہا۔ پھر ان پر بگڑتے ہوئے کہا: ''حکیم صاحب کیا سوچتے ہوں گے۔ کتنی توجہ سے انھوں نے دیکھا تھا آپ کو اور آپ ہیں کہ لوٹ کر گئے نہیں۔''

''بیچ میں جن لوگوں کے یہاں رہا تھا، ان لوگوں نے ڈاکٹر کو دکھایا تھا مجھے، تمھیں بتا چکا ہوں۔''

''لیکن اسے بھی تو بہت دن ہو گئے۔''

بھائی خاموشی سے میری بات سنتے رہے۔ میں نے آگے کہا:

''ابھی تو آپ کربلا کی مرمت میں منتظمین کے ساتھ لگے ہیں، جب اس کی مرمت پوری ہو جائے گی اور صحنچیاں خالی کرائی جائیں گی تو کہاں جائیں گے؟''

''جب وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔''

''آج کل میں تو یہ ہونا ہی ہے، اس لیے میرے ساتھ چل کر رہیے۔''

''نہیں، یہاں مجھے بہت آرام ہے، سب کچھ گھر جیسا ہے۔'' وہ بولے۔ پھر کہا:
''اور اب تو شامہ میرا زیادہ خیال رکھنے لگی ہے، کسی بات کی تکلیف نہیں ہونے دیتی۔''

''لیکن اُن لوگوں کو بھی تو یہ جگہ چھوڑنا پڑے گی۔ تب؟''

''تب دیکھا جائے گا۔''

باتیں کرتے کرتے جب بہت دیر ہو گئی تو میں نے بھائی سے چلنے کی اجازت لی اور صحنچی کے باہر کھڑے ہوئے شامہ کے بھائی سے کہا:

''اپی کو بلا دو۔''

شامہ آئی تو میں نے اس سے کہا: ''بار بار بھائی کے لیے کہنا آپ سے اچھا نہیں لگتا۔ پچھلی بار اُن کے لیے آپ کو پیسے دے کر گیا تھا اور اس بار.........'' میں کہتے کہتے رکا۔

''اس بار.........کیا کہنا ہے، کہیے۔''

''بھائی کو حکیم صاحب کے یہاں جانے کے لیے راضی کیجیے۔ آپ کا کہا نہیں ٹالیں گے۔''

''کون حکیم صاحب؟''

''چوک میں مطب کرتے ہیں، دارالشفا میں۔''

''تو انھیں کو تو اماں بھی دکھانے جاتی ہیں۔''

''کیوں؟''

''طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ان کی۔''

''کیا شکایت ہے؟''

''یہی تو معلوم نہیں۔ اِدھر کچھ دنوں سے حلق کی نلی میں تکلیف ہے۔ کھانا کھانے میں دقت ہوتی ہے۔''

''پریشان مت ہوں۔ حکیم صاحب کے ہاتھ میں شِفا ہے۔ انشاء اللہ فائدہ ضرور ہوگا۔'' میں نے کہا پھر کہا: ''بھائی کو راضی کر لیجیے گا دکھانے کے لیے۔''

یہ کہہ کر میں چلنے لگا تو اس نے مجھے روک لیا، پھر وہ صحنچی کے اندر گئی اور فوراً ہی مختلف قسم کے کپڑوں کے تین ٹکڑے ہاتھوں میں لیے باہر نکلی۔

''اِن میں سے کون سا پسند ہے آپ کو۔'' اُس نے کہا اور کہہ کر مجھے سر سے پیر تک پہلی بار اچھی طرح دیکھا۔

میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''بتایئے ان میں سے کون سا پسند ہے؟''

''کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''آپ بتایئے کون سا پسند ہے؟''

''یہ۔'' میں نے ان میں سے ایک ٹکڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس کی چمکتی ہوئی پیشانی اور دمکتے ہوئے رخساروں کو بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اس سے کچھ کہے بغیر کربلا سے باہر نکل آیا۔

کربلا سے باہر آ کر میں نے سوچا۔ بھائی کی صحت بگڑتی جا رہی ہے، اب انھیں اپنے ساتھ رکھنا ضروری ہے۔ میں نے طے کر لیا کہ اگلی بار آؤں گا تو انھیں اپنے ساتھ ضرور لے جاؤں گا۔

●

بھائی کو اپنے ساتھ لا کر رکھنے کا پکا ارادہ کرنے کے باوجود میں اپنی الجھنوں میں ایسا گرفتار ہوا کہ کئی ہفتے گزر جانے کے بعد بھی کربلا نہیں جا سکا۔ بیچ بیچ میں مجھے بھائی کی طبیعت کے بگڑنے کا خیال آتا رہا۔ پھر ایک دن اُدھر سے آنے والے ایک شخص سے جو اس کربلا میں ہونے والی مجلسوں میں شریک ہوتا رہتا تھا، خبر ملی کہ اس کربلا کے متولی اور صحنچیوں میں رہنے والوں کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا ہے۔ اور تب مجھے بھائی اور اسی کے ساتھ شامہ کے گھر والوں کی فکر ہوئی اور دوسرے ہی دن میں علی الصباح کربلا پہنچ گیا۔ بھائی اپنی صحنچی میں سوئے ہوئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے انھیں صبح کے وقت سوتا ہوا پایا۔ میں نے انھیں جگانے کے لیے بہت آہستہ سے آواز دی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ خود سے اٹھنے میں انھیں زحمت ہو رہی ہے، اس لیے میں نے انھیں سہارا دے کر چٹائی پر بٹھایا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ کی۔''

''تم کب آئے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''بس ابھی۔''

''نماز کا وقت ہو گیا؟''

''اب تو سورج نکل آیا ہے۔''

''آج آنکھ لگ گئی۔''

''کمزوری بہت ہے۔''

''ہاں، ادھر طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔''

میں نے دیکھا کہ بھائی کے چہرے پر اچھی خاصی سوجن ہے اور زردی بھی۔

''حکیم صاحب کے یہاں تو گئے نہیں ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''شامہ تو روز کہتی تھی، میں ہی آج کل پہ ٹالتا رہا۔'' بھائی کو بولنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

''یہ لوگ ہیں نہیں شاید۔ برابر سے کوئی آواز نہیں آ رہی ہے؟'' میں نے شامہ کی صحنچی

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کل ہی اپنے کسی عزیز کے یہاں گئے ہیں، پرانے لکھنؤ کی طرف۔'' پھر بولے:

''متولی سب کو پریشان کر رہا ہے۔''

''کیوں؟''

''کہتا ہے یا کرایہ دو یا جگہ خالی کرو۔''

''آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔''

''آیا تھا میرے پاس بھی، لیکن ہمت نہیں پڑی۔'' انھوں نے کہا۔ پھر بولے: ''مجھ سے ہمت نہیں پڑے گی۔ میں نے یہاں بہت کام کرایا ہے۔''

''شامہ کے گھر والے واپس آئیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

یہ سن کر بھائی نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا۔ پھر بولے: ''ضرور آئیں گے۔ صحنچیاں خالی کرانا اتنا آسان نہیں۔'' پھر کہا: ''تمہارے دیے ہوئے روپیوں میں سے جتنے شامہ کے پاس بچے تھے وہ اس نے مجھے دے دیے ہیں۔''

''میں آج آپ کو لینے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور آپ کو چلنا ہے میرے ساتھ۔''

''نہ چلا تو؟'' بھائی نے بگڑتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو یہاں اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا۔ صرف دیکھ بھال سے آپ ٹھیک نہیں ہوں گے۔ آپ کا ڈاکٹری معائنہ ہوگا اور آپ کو مستقل دوا کھانا پڑے گی۔''

بھائی کچھ نہیں بولے۔ میں نے ان کا سامان سمیٹنا شروع کیا اور سب سے پہلے بھائی کے لیے شامہ کی لائی ہوئی چیزوں کو بڑی احتیاط سے صحنچی کے طاقوں پر پڑے ہوئے ریشمی پردوں میں باندھا۔ پھر باقی سامان بھائی کی چٹائی پر بچھی ہوئی چادر میں لپیٹا پھر انھیں سہارا دے کر اٹھایا اور ایک سواری پر بٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ کربلا سے نکلتے وقت میں نے شامہ کی صحنچی کی طرف دیکھا اور سوچا: ''کہیں متولی ان لوگوں سے صحنچی خالی نہ کرا لے۔''

●

بھائی کو گھر لا کر سب سے پہلے میں نے انھیں ایک اچھے ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے ان

کی حالت کو تشویشناک بتاتے ہوئے کئی طرح کے معائنوں کے لیے کہا۔ ان کا پیشاب بند ہو چکا تھا۔ معائنے ہوئے تو معلوم ہوا کہ بھائی کے گردے پوری طرح خراب ہو چکے ہیں اور اب ان کا صحتیاب ہونا مشکل ہے۔

مجھے حکیم خورشید کی بات یاد آئی اور ان کے کمپاؤنڈر کی بھی۔

''اُن کے گردوں پر ورم ہے، علاج نہیں کرایا تو........''

میں نے ڈاکٹر سے بھائی کو ہسپتال میں بھرتی کرانے کی بات کی تو اس نے کہا:

''فضول ہے۔ آپریشن کر کے پیشاب کے لیے تھیلی لگائے دیتا ہوں۔''

نوکری کے ساتھ اس حالت میں بھائی کی دیکھ بھال میرے لیے مشکل تھی اس لیے میں نے انھیں منجھلے کے یہاں اس لیے منتقل کر دیا کہ وہاں منجھلے کی بیوی ان کی دیکھ بھال کر لیں گی۔ میں نے مہینے بھر کی دوائیں جو ڈاکٹر نے بتائی تھیں خرید کر منجھلے کی بیوی کو دے دیں اور انھیں ان کے استعمال کا وقت اور طریقہ بھی بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔ منجھلے کی بیوی نے بھائی کی لگ کر تیمارداری کی۔ میں ہر شام منجھلے کے یہاں پہنچ جاتا اور دیر رات تک بھائی کے پاس بیٹھا رہتا۔ بھائی بڑھتی ہوئی کمزوری کے باوجود زیادہ باتیں کرنے لگے تھے اور ان باتوں میں وہ شامہ اور اس کی ماں کے بارے میں پوچھنا نہیں بھولتے تھے۔ میں اٹھنے لگتا تو کہتے:

''شامہ کی طرف جا کر ان لوگوں کی خیریت ضرور معلوم کر لینا۔''

''جاؤں گا، جیسے ہی فرصت ملے گی جاؤں گا۔''

بھائی حکیم خورشید اور آغا سودائی کے بارے میں بھی ضرور معلوم کرتے رہتے۔ باتیں کرتے کرتے انھیں اچانک ان دونوں کا خیال آتا، پوچھتے:

''حکیم خورشید کی طرف گئے تھے؟''

''نہیں، وہاں بھی نہیں جا سکا۔''

''آغا سودائی کی طرف؟''

''ادھر بھی جانا نہیں ہوا۔''

''بہت مصروف رہنے لگے ہو۔'' بھائی ناراض ہو کر کہتے۔ پھر کہتے:
''ماں کی طرف بھی نہیں گئے ہو گے؟ کم سے کم ایک چراغ تو جلا آیا کرو اس کی قبر پر۔''
''جاتا ہوں، آج ہی گیا تھا۔ وہاں چراغ بھی جلتا ہے اور قبر کی صفائی بھی ہوتی ہے۔''

●

شدید بیماری کے باوجود بھائی نے اس بار ماں کے فاتحے میں بڑی دلچسپی لی۔ منجھلے سے زیادہ سے زیادہ عزیزوں کو بلانے کے لیے کہا اور یہ بھی کہا کہ کھانا پہلے سے اچھا ہوا اور بہت زیادہ ہو۔ میں نے اور منجھلے نے ان کی ہر ہر بات پر عمل کیا۔ بھائی نے فاتحہ میں شریک ہونے والوں سے دیر تک ماں کی باتیں کیں۔ یہ باتیں کرتے وقت معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔ لیکن فاتحہ کے دوسرے ہی دن بھائی کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ میں دفتر سے لوٹ کر منجھلے کے گھر پہنچا تو منجھلے، ان کی بیوی اور میرے کچھ عزیز بھائی کے بستر کے چاروں طرف بیٹھے تھے۔ سردی بہت شدید تھی، منجھلے کی بیوی نے ایک انگیٹھی میں املی کے بہت سے کوئلے جلا کر اُسے بھائی کے بستر کے قریب رکھ دیا اور ان کے بدن پر ایک کے بجائے دو لحاف ڈال دیے۔ بھائی کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ دھیرے دھیرے ان کی سانس اکھڑنے لگی اور کچھ دیر بعد ان کا دم نکل گیا۔ اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ منجھلے کی بیوی نے آگے بڑھ کر اُن کی آنکھیں بند کیں اور ان کے پیر کے دونوں انگوٹھے آپس میں باندھ دیے۔ میں اور منجھلے دونوں بھائی کے سرہانے خاموش کھڑے تھے۔ منجھلے کے دونوں بچے بھائی کی موت سے بے خبر باہر گلی میں کھیل رہے تھے۔

دوسرے دن بھائی اسی کربلا میں دفن ہوئے جہاں ماں دفن تھی، اس کی قبر سے کچھ ہی دور۔ بھائی کی موت کے کئی دن بعد جب عزیزوں اور جاننے والوں کی تعزیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے بھائی کی بڑی مجلس کے لیے رقعہ لکھنا شروع کیا اور اُن کے بارے میں لکھا:

''....بچپن سے دماغ میں خلل تھا۔ طبیعت کو ایک جگہ پر قرار نہیں رہا۔ عمر بھر ٹھکانے بدلتے رہے۔ خوبرو اور دراز قد تھے۔ لہجہ شائستہ اور گفتگو دلچسپ تھی۔ خلل کبھی کبھی جنون میں بدل جاتا۔ حافظہ بہت

تیز اور آواز بہت اچھی تھی۔ اساتذہ کی بیسیوں غزلیں یاد تھیں جنھیں بڑی خوش لحنی سے پڑھا کرتے۔ جوان ہوتے ہی گردوں کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ علاج ٹھیک سے نہیں کیا۔ مرض بڑھتا گیا۔ اُسی عالم میں یہاں وہاں رہتے رہے۔ پچاس برس کی عمر میں بالآخر اپنوں کے درمیان آخری سانس لی۔.....کی دوپہر کربلا ملکہ جہاں میں دفن ہوئے۔ اِسی کربلا میں اُن کی ماں بھی آسودۂ خاک ہیں۔''

●

جب رقعہ چھپ گیا تو میں عزیزوں اور ملاقاتیوں میں اسے بانٹنے کے لیے نکلا اور حکیم خورشید کو بھی یہ رقعہ دینے دارالشفا گیا اور جب اس کھڑکی پر گیا جہاں مریضوں کے پرچے بنتے تھے تو وہاں ایک نیا چہرہ دکھائی دیا۔ وہاں سے میں کمپاؤنڈر کی طرف گیا تو دیکھا کہ دواؤں کے نسخے کوئی اور باندھ رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا:

''جو صاحب پہلے نسخے باندھتے تھے وہ..........''

''انتقال ہو گیا۔ دو مہینے پہلے۔ انھیں کی جگہ پر مجھے رکھا گیا ہے۔''

''اور حکیم صاحب؟''

''حکیم نہیں ڈاکٹر کہو۔''

''میں حکیم خورشید کی بات کر رہا ہوں۔''

''یہاں کب سے نہیں آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی چھ مہینے سے۔''

''حکیم صاحب کا چار مہینے پہلے انتقال ہو گیا۔''

''کیسے؟ پچھلی بار میں آیا تھا تو بالکل ٹھیک تھے۔''

''ایک دن، اسی مطب کے اندر گردوں میں شدید درد ہوا، اپنی دوا لی لیکن گھر جاتے جاتے آنکھ بند ہو گئی۔''

''اب کون بیٹھتا ہے؟''

''ان کے بیٹے ....اور حکیمی کے بجائے ڈاکٹری علاج کرتے ہیں۔'' پھر ایک پڑیا میں سفوف باندھتے ہوئے بولا: ''دکھانے آئے ہو؟''

''نہیں۔'' یہ کہہ کر میں اس کھڑکی سے ہٹ آیا۔

دارالشفا سے نکل کر میں خواجہ کی حویلی کی طرف یہ دیکھنے کے لیے گیا کہ اگر بدر جہاں اس عمارت کی نئی تعمیر کے بعد وہاں رہنے لگی ہوں تو انھیں بھائی کے مرنے کی اطلاع دے دوں۔ وہاں پہنچا تو حویلی کے پوری طرح ٹوٹ جانے کے باوجود اس پر تعمیر کا کام ابھی تک شروع نہیں ہوا تھا۔ آس پاس کے لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ حویلی کی ملکیت کے سلسلے میں کچھ تنازعہ پیدا ہو گیا ہے۔ بدر جہاں کو پوچھا تو پرانے رہنے والوں نے بتایا کہ نئے لکھنؤ میں کہیں بہت دور رہتی ہیں۔

''اپنے بھائی کے ساتھ؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، انھوں نے اپنے ساتھ نہیں رکھا۔''

''پھر؟''

''ان کے کسی پرانے عزیز نے اپنے گھر میں رہنے کی جگہ دے دی ہے۔''

ہاتھوں میں بھائی کی مجلس کے رقعے لیے اب میں گول دروازے سے کمپنی باغ کی طرف بڑھا لیکن کمپنی باغ کی زمین پر پکی عمارتیں مجھے دور ہی سے نظر آنے لگیں۔ آغا سودائی کا ٹھکانہ ان عمارتوں میں کہاں پر تھا میں سمجھ ہی نہ سکا۔ میں نے سوچا: ''مر چکے ہوں گے وہ بھی۔'' میں نے اس علاقے میں اپنے کچھ اور عزیزوں میں یہ رقعے تقسیم کیے اور گھر لوٹ آیا۔

دوسرے دن میں پھر رقعے بانٹنے کے لیے نکلا اور سب سے پہلے اس کربلا کی طرف گیا جہاں شامہ رہ رہی تھی۔ شامہ کو بھائی کی موت کی اطلاع ان کے مرنے کے فوراً بعد ہی دینا چاہیے تھی لیکن بھائی کے آخری رسوم اور اس کے بعد کے مرحلوں نے مجھے اس کربلا تک پہنچنے نہیں دیا۔ کربلا جاتے وقت راستے بھر میں سوچتا رہا کہ یہ اطلاع میں شامہ کو کس طرح دوں گا۔

''اسے بہت دکھ ہوگا اور اس سے زیادہ اس کی ماں کو۔'' میں نے سوچا۔

بھائی کے ساتھ رہتے رہتے شامہ بھائی کو بہت عزیز رکھنے لگی تھی۔ میں نے سوچا میں

اسے فوراً نہیں بتاؤں گا۔ پہلے ادھر ادھر کی باتوں کے ذریعے اسے اس خبر کے لیے ذہنی طور پر تیار کروں گا اور جب یقین ہو جائے گا کہ یہ بری خبر سننے کے لیے وہ تیار ہے، اسی وقت اسے بتاؤں گا کہ بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ یہی سوچتے سوچتے میں کربلا پہنچ گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی شامہ کی صحنچی کی طرف گیا اور آواز دی:

''کوئی ہے؟''

اندر سے ایک شخص نکلا جسے میں نہیں پہچانتا تھا۔

''کہیے۔''

''شامہ ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اور جب اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو میں نے کہا:

''جو یہاں رہتی ہیں۔''

''اب نہیں رہتیں۔'' اس نے کہا۔ پھر پوچھا: ''آپ اُن کے چھوٹے بھائی ہیں جو برابر والی صحنچی میں رہتے تھے؟''

''جی۔''

یہ سن کر وہ اندر گیا اور اخبار میں اچھی طرح سے لپٹی ہوئی ایک چیز لا کر مجھے دیتے ہوئے بولا:

''جنہیں آپ پوچھ رہے ہیں وہ آپ کے لیے دے کر گئی ہیں۔''

''اب کہاں رہتے ہیں وہ لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹھکانہ بتا کر نہیں گئے۔ متولی سے کچھ جھگڑا ہوا تھا، اسی لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر بولا:

''کسی اور کربلا میں جانے کی بات کر رہے تھے۔'' اس سے آگے اس شخص نے نہ کچھ کہا نہ میں نے اس سے پوچھا۔

●

رقعے میں لکھی ہوئی تاریخ اور دن کے مطابق بھائی کی مجلس ہوئی۔ اس مجلس میں بہت لوگ جمع ہوئے اور مجلس کے بعد بہت دیر تک بھائی کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔

میں اس مجلس کے دوسرے ہی دن سے شہر کے امام باڑوں اور کربلاؤں میں شامہ اور اس کے گھر والوں کو ڈھونڈنے نکل پڑا۔ شہر کی بہت سی کربلاؤں اور امام باڑوں میں مرمت کا کام چل رہا تھا، بہت سی کربلائیں اور امام باڑے اب بھی ویران پڑے تھے جن کی صحنچیوں میں کچھ کچھ لوگ آباد ہونے لگے تھے۔ میں ان میں سے ہر کربلا اور ہر امام باڑے میں گیا لیکن ہفتوں اور مہینوں کی تلاش کے باوجود کسی امام باڑے اور کسی کربلا میں ان کا پتہ نہیں چلا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے یاد آیا کہ میں جب بھائی کے آخری ٹھکانے پر شامہ کو بھائی کی مجلس کا رقعہ دینے گیا تھا تو شامہ کی صحنچی کے نئے رہنے والے نے مجھے اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز دی تھی جسے گھر لا کر میں کسی وجہ سے کھولنا بھول گیا تھا۔ یہ بات یاد آتے ہی میں نے اخبار میں لپٹی ہوئی اس چیز کو نکالا تو دیکھا کہ یہ ایک خوبصورت کڑھا ہوا کرتا ہے۔ یہ کرتا اسی کپڑے کا تھا جسے شامہ کے لائے ہوئے تین ٹکڑوں میں سے میں نے پسند کیا تھا۔ میں اس کرتے کو دیر تک دیکھتا رہا پھر اسے ایک ہینگر میں لگا کر اپنے بستر کے سامنے والی دیوار پر ٹانگ دیا۔ میرے کمرے میں جو بھی آتا ہے اس کی نظر اس کرتے پر ضرور پڑتی ہے اور وہ اس کی عمدہ کڑھائی کے بارے میں ضرور پوچھتا ہے۔ مگر میں کسی کو نہیں بتاتا کہ چکن کا یہ خوبصورت کام کس کی انگلیوں کا ہنر ہے۔

مصنف کی دوسری تصنیفات

• اردو غزل میں علامت نگاری			(ناشر: اترپردیش اردو اکادمی)
• یگانہ	:	انتخاب	(ناشر: اترپردیش اردو اکادمی)
• قائم چاندپوری	:	انتخاب	(ناشر: اترپردیش اردو اکادمی)
• ادب کی باتیں	:		تنقیدی مضامین
• کوے اور کالا پانی (ترجمہ)	:		نرل ورما، بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی
• مسعود حسن رضوی ادیب (مونوگراف)	:		بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
• بحث و تنقید	:		تنقیدی مضامین
• غزل کا نیا علامتی نظام	:		(ناشر: اترپردیش اردو اکادمی)
• روحِ انیس	:		مسعود حسن رضوی ادیب
تصحیح و ترتیب و پیش گفتار	:		بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
• خوشبوے خاک	:		رپورتاژ

زیر اشاعت

• کتبے پڑھنے والے	:	افسانے
• شہر عدم رفتگاں	:	شاعری
• جدید مغربی مصنفین		

دکھیارے
Dukhyare
By
Anis Ashfaq